# حزب التحریر کی مسلمانوں کو

# صدائے دلسوز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# حزب التحریر کی مسلمانوں کو

# صدائے دلسوز

**اے مسلمانو!**

اس بات میں کسی کو شک نہیں کہ تم روحانی پستی کی حد تک پہنچ چکے ہو، مادی اور ذہنی پسماندگی کا شکار ہو اور سیاسی زوال کی بدترین شکل تمہارے سامنے ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ تمہارے معاشرے میں اسلام سے تعلق مفقود ہو چکا ہے اور اُس کی جگہ زر پرستانہ تعلق نے لے لی ہے، یعنی تم نے اپنے آپ کو نظام ہائے کفر سے وابستہ کر لیا ہے۔ اِس بات پر کون شک کر سکتا ہے کہ امّتِ مسلمہ کے درمیان اسلامی اخوت کا بندھن ٹوٹ چکا ہے اور یہ مقام قوم پرستی نے حاصل کر لیا ہے یعنی تم نے رشتۂ اسلام کو توڑ کر اپنے آپ کو مختلف برادریوں اور مسالک سے وابستہ کر لیا ہے۔ درحقیقت اسلامی اخوت کا رشتہ ایک علاقے تک بھی محدود نہیں رہ پا رہا ہے یعنی کسی ایک علاقے کے لوگ ہی اسلام کی بنیاد پر نہیں جڑ پا رہے ہیں بلکہ وہ علاقائی بنیاد پر وطنیت سے اپنے آپ کو جوڑ رہے ہیں۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسلامی افکار کے نام پر تو تمہارے

پاس عبادات کے سوا کچھ باقی نہیں، اور رہی تمہارے جذبۂ اسلامی کی تسکین، تو یہ صرف مولویوں سے مل کر ہی پوری ہو جاتی ہے۔ تمہاری سوچ بھی دوسری قوموں کے لوگوں کی طرح ہو گئی ہے، تمہیں اِس بات کا احساس ہی نہیں ہے جبکہ تمہارے دشمن یہ سمجھ رہے ہیں کہ تمہاری یہ عظیم الشان امّت تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی ہے، یہ اپنی امتیازی شان کھو چکی ہے، اِسکی مخصوص صفات ختم ہو چکی ہیں، نیتجتاً یہ قوّتِ عمل سے محروم ہو گئی، ذہنی طور پر مفلوج ہو گئی اور اِس کا اسلامی تشخص بھی باقی نہیں رہا۔ خاص طور سے اب امت میں ایسے افراد کی تعداد بہت ہی کم رہ گئی ہے جن کی اسلام کیلئے وفاداری دوسری وفاداریوں سے بالاتر ہو۔ وہ مسلمان جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ، اُسکے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور اُسکے راستہ میں جہاد کو اپنی ترجیحات میں سب سے اونچا درجہ دیتے ہوں، شاذو نادر ہی پائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے اندر کفّار سے شکست کھانے کا احساس ختم ہو گیا ہے، سوائے چند لوگوں کے جو اِن حالات میں بھی اسلامی زندگی گزار رہے ہیں۔

امّتِ واحدہ کی حیثیت سے امّتِ مسلمہ اور کفّار کے درمیان کشمکش مسلسل تیرہ سو سال تک جاری رہی، اسلام بحیثیتِ دین اور ایک منفرد نظامِ زندگی اور کفر کے درمیان تصادم بھی ان تیرہ سو سالوں میں برابر جاری رہا۔ تیرھویں صدی ہجری بمطابق اُنیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں سرمایہ دارانہ نظام نے، جو کہ ایک کافرانہ نظام ہے، اسلامی نظام کو فکر اور جذبہ دونوں تعلق سے چیلنج کیا۔ کچھ عرصہ میں ہی مسلمان شکست خوردہ ہو گئے۔ ذہنی طور پر مرعوب ہونے کے بعد تباہ کن سیاسی محکومی اُن کا مقدّر بن گئی، تاہم واقعتاً اسلام نے شکست نہیں کھائی تھی اور اس کو کبھی

شکست دی بھی نہیں جاسکتی کیونکہ یہ اور صرف یہی حق ہے۔ یہ کس طرح ہوا کہ اسلام تو میدانِ کارزار میں ڈٹا رہا لیکن اسکے ماننے والے شکست کھا گئے اور وہ اِس جدوجہد میں اسلام کے صحیح مقام کا ادراک بھی نہیں کر پائے؟ جہاں تک اسلامی افکار کے چیلنج کا تعلق ہے تو اُن پر زبردست تنقید اور جھوٹے پروپیگنڈے کے ذریعہ کیا گیا۔ کافر اقوام مسلسل مسلمانوں سے نبرد آزما رہیں اور اُن کا مسلمانوں سے یہ مطالبہ رہا کہ وہ پیش آمدہ مسائل کو اُن کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق حل کریں، مسلمان اپنے احکام اور اُن کے نفاذ کا طریقہ نئے بدلے ہوئے زمانے کے مطابق تبدیل کریں۔ اِن دو اُمور کے تعلق سے مسلمانوں کی پوزیشن بہت کمزور رہی۔ مسلمانوں نے اِس کا جواب دینا چاہا لیکن متضاد کوششوں کی وجہ سے وہ ناکام رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بددل ہو گئے اور اِن معاملات میں اُنہوں نے بے اعتنائی اختیار کر لی۔

سرمایہ پرستوں نے تعدّدِ ازواج پر سخت اعتراض کیا اور دعویٰ کیا کہ یہ سراسر انصاف کے خلاف ہے کہ ایک مرد کو دو، تین یا چار عورتوں سے شادی کی اجازت ہو۔ اُنہوں نے الزام لگایا کہ اسلام عورتوں کو عزّت نہیں دیتا۔ سرمایہ داریت کے پیروؤں نے طلاق سے متعلق اسلامی احکام پر بہتان تراشی کی اور اِس بات کا پروپیگنڈہ کیا کہ یہ عورتوں کے ساتھ فریب ہے جس سے اُن کے گھر تباہ ہو رہے ہیں۔ (ایک آدمی کو اِس کی اجازت کیسے دیجا سکتی ہے کہ وہ جب چاہے عورت کو طلاق دیدے جبکہ وہ باہم ایک دائمی بندھن میں بندھ چکے ہوں؟) پھر اُنہوں نے خلافت پر اپنا نشانہ سادھا اور اُسے آمریت سے تعبیر کیا۔ (ایسی حکومت میں انصاف کیسے ممکن ہے جس میں تمام

قانونی اختیارات صرف ایک آدمی کے ہاتھ میں ہوں جبکہ اُس سے غلطی کا بھی امکان ہے اوروہ مطلق العنان بھی ہو سکتا ہے؟) اُن کا یہ دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک خلیفہ کو مذہبی تقدس کا مقام حاصل ہے اس لئے نہ تو اُسکے کسی عمل پر ملامت کی جاسکتی اور نہ اُس پر کوئی اعتراض کر سکتا ہے۔ اُنہوں نے جہاد پر اعتراض کیااور کہا کہ یہ دوسروں کے خلاف جارحیت ہے اور انسانی خون کا زیاں ہے۔ اس طرح جہاد کو ایسا وحشیانہ اور ظالمانہ عمل بتایا جو نا قابلِ بیان ہے۔ اُنہوں نے قضاء اور قدر کے تصوّر کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایااور دعویٰ کیا کہ اسکے معنی یہ ہوئے جو کچھ بھی واقع ہو رہاہے اُس کے سامنے ہتھیار ڈالنا ہے اور اِس طرح لوگ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے سے فرار اختیار کرتے ہیں۔ اِس انداز سے اُنہوں نے احکامِ شرعیہ اور اسلامی افکار کا مطالعہ کیا، اُن پر بے جا تنقید کی اور اُنہیں بدنام کیا، اُنہیں فاسد افکار بتایا اور کہا کہ یہ سچّائی سے بہت دور ہیں اور یہ زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ اِسکے علاوہ اُنہوں نے ان مسائل کے حل پیش کرنا شروع کئے اور سوال اُٹھائے کہ اسلام اِن مسائل کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کے پاس اِن کا کوئی حل نہیں ہے۔ اُنہوں نے دریافت کیا کہ بیمہ کے بارے میں اسلام کا کیا حکم ہے؟ اُنہوں نے سوال کیا کہ ریاستوں کے درمیان تجارتی تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی؟ اِس کے لئے شرعی احکام کیا ہیں؟ (کیا اسلام دوسرے ملکوں کے ساتھ تجارت کی اجازت دیتا ہے یا یہ تجارت کا حق چھین لیتا ہے؟ اُنہوں نے پارلیمانی نظام اور آزادانہ انتخاب کا معاملہ اُٹھایا کہ اِن کے تعلق سے اسلام کیا کہتا ہے؟) اُنہوں نے معلوم کرنا چاہا کہ قانون سازی

میں اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے، اسلام کا جھکاؤ مادیت کی طرف ہے یا روحانیت کی طرف؟ یہ نصِ قرآن کے الفاظ کو مانتا ہے یا اُن الفاظ کے معانی پر زور دیتا ہے؟ اُنہوں نے عام آزادیوں کے تعلق سے بھی سوال کئے مثلاً فرد کی آزادی، اظہارِ رائے کی آزادی اور آزادئ مذہب کے بارے میں اسلام کا کیا حکم ہے؟ کیا اسلام اِن میں سے کسی آزادی کی اجازت دیتا ہے؟ اُنہوں نے روحانی تصور کا فلسفہ پیش کیا (کیا یہ خیال اور سوچ ہے یا یہ ایک اخلاقی اور نیک عمل ہے؟ یا یہ وہ چیز ہے جو زمانۂ قدیم سے لوگ سمجھتے آئے ہیں کہ روح اور جسم دو مختلف چیزیں ہیں اور آدمی روح اور جسم دونوں سے مل کر بنا ہے؟) اِس سوچ کے ساتھ اُنہوں نے ان مسائل کو اُٹھایا کہ معاشرے میں آدمی کو اِن مسائل سے الجھنا پڑتا ہے۔ حالانکہ یہ مسائل پیداوار ہی سرمایہ دارانہ معاشرے کی ہیں، اسلامی معاشرے میں اِن کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اِس طرح اُنہوں نے اِن مسائل کا حل دریافت کیا۔ یہ وہ سوالات تھے جن میں اُنہوں نے مسلمانوں کو الجھانا چاہا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام میں یہ اہلیت نہیں ہے کہ وہ اِن مسائل کو حل کر سکے اور یہ کہ مسلمان اسلام کے ذریعہ اِن مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔

سرمایہ دار صرف اِس پر ہی اکتفاء کر کے نہیں رہ گئے بلکہ اُنہوں نے اسلامی جذبات اور احساسات کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اِس طرح اُنہوں نے مسلمانوں کی اسلام سے وابستگی کا مذاق اُڑایا۔ اُن کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کی اسلامی احکامات سے وابستگی کی وجہ سے تعصب، کٹّرپن، نفرت اور تشدّد پیدا ہوتا ہے، اِسلئے لوگوں کو اسکے خلاف اُٹھ کھڑا ہونا چاہیئے۔ اُنہوں نے مسلمانوں کی کفر اور کفّار

سے نفرت، اور اسلام اور مسلمانوں سے محبت پر اعتراض کیا۔ اُنھوں نے اِس چیز کو تعصب اور کٹرپن کا نام دیا۔ زر پرستوں کا کہنا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے چاہے وہ اُسے پسند کرے یا نہ کرے۔ (ایک مسلمان اورایک یہودی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا)۔ کفار کے خیال میں ہر ایک شخص کو اپنی رائے اور مذہب اختیار کرنے کا حق ہے، رائے صرف رائے ہے اِس کو ایک دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ (پھر کیوں مذاہب کے درمیان امتیاز کیا جائے اور انسانوں کے درمیان نفرت اور محبت کو حائل کیا جائے؟) پھر مزید یہ کہ انہوں نے قومی جذبات کو ہوا دی، ترکوں کو عربوں کے خلاف قوم پرستی کی بنیاد پر بھڑکایا، اِسی طرح عربوں کو ترکوں کے خلاف اُکسایا۔ اسلامی جذبات کو اُنھوں نے بدنام کیا، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے تقدّس کو پامال کیا اور کہا کہ یہ سب مذہبی کٹرپن ہے۔ اُنھوں نے اِس بات کی وکالت کی کہ مسلمانوں کو اسلام کی اتنی پرواہ نہیں کرنا چاہئے اور اُسکے احکامات سے اتنا زیادہ لگاؤ مناسب نہیں ہے۔ اِس کو اُنھوں نے مذہبی رواداری کا نام دیا۔ اُن کا یہ سوچنا ہے کہ اگر کوئی قرآن مجید پر تنقید کرتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ و سلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے یا صحابۂ کرام پر بہتان تراشی کرتا ہے تو اِس پر مسلمانوں کو جذبات میں آکر بھڑکنا نہیں چاہئے۔ اُن کا مؤقف ہے کہ یہ تو ایک عالمانہ بحث کا موضوع ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ مثلاً قرآن مجید حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان کرتا ہے جب کہ تاریخ میں اِبراہیم نام کا کوئی شخص ہی نہیں ہوا جس سے اِس قصّے کی تصدیق ہو سکے، دوسرے یہ کہ قرآن مجید حضرت محمد صلی اللہ علیہ و سلم کی تصنیف تھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ اللہ کا کلام

ہے تاکہ لوگوں کو اِس کا اتباع کرنے پر آمادہ کیا جاسکے۔ اِسکے علاوہ بھی اُن کا بہت کچھ کہنا ہے اور اُن کا اصرار ہے کہ مسلمانوں کو اِس کذب بیانی پر مشتعل نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اُنہیں تو یہ سب علمی تحقیق سمجھ کر تسلیم کرنا چاہیئے۔ اِس طرح وہ اِس بات کے درپے ہو گئے کہ اس قسم کے جذبات یعنی خوشی، غم، غصّہ، ناراضگی، محبت و نفرت یہ سب اسلامی افکار کے ہی نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اِن جذبات کے پیچھے جو محرّک تھا اُسے اُنہوں نے بدل دیا تاکہ یہ اپنی اسلامی خصوصیت کھو دے۔

بہت ہی منظم طریقے سے اسلامی افکار، احکام اور احساسات کو اِن لوگوں کی طرف سے چیلنج کیا گیا۔ یہ ایک فطری بات تھی بلکہ ناگزیر تھا کہ مسلمان اِس چیلنج کو قبول کرتے اور عقلی محاذِ جنگ پر کفار کے اِن چیلنجوں کا جواب دیتے، بلکہ یہ مسلمانوں کا دینی فریضہ تھا کہ وہ خود آگے بڑھ کر اِن خرافات کا جواب دیتے اور کفار پر اسلام کی حقانیت واضح کرتے کیونکہ مسلمانوں کی حیثیت حاملینِ دعوت کی ہے اور وہ اِنسانیت کیلیئے اللہ کا عظیم الشان پیغام رکھتے ہیں۔ اِسکے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اسلامی افکار کے خلاف اِس قدر پروپیگنڈہ کیا گیا اور اُنہیں اتنا تضحیک کا نشانہ بنایا گیا کہ خود مسلمان ان چیزوں پر شرم اور بے عزّتی محسوس کرنے لگے اور اُنہوں نے اِن چیزوں کے تعلق سے عموماً معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا۔ تعددِ ازواج کا دفاع اِس طرح کرنے لگے کہ یہ تو صرف مخصوص حالات میں بیویوں کے ساتھ عدل کی بنیاد پر مشروط ہے۔ اِس حقیقت سے اُنہوں نے بچنا چاہا کہ اسلام میں طلاق کی اجازت ہے، اِس کو اِس طرح کہنے لگے کہ اسلام اِس کی اجازت نہیں دیتا

سوائے کچھ مخصوص حالات کے۔ خلافت کے اوپر جو بھی الزام تراشی کی گئی اُس کو مسلمانوں نے قبول کر لیا اور خاموشی اختیار کر لی، یہاں تک کہ عثمانی دور کے اواخر میں اِس نظام کو ہی تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ خلافت کے خاتمے کے بعد مسلمان اس کا ذکر تک کرنے میں گھبرانے لگے اور بر سرِ عام اُس کا تذکرہ کرنے کی اُن میں جرأت نہیں رہی۔ یہ جہاد کے مسئلے پر مدافعت پر اتر آئے اور کہنے لگے کہ یہ تو اسلام پر ایک بہتان ہے۔ اس کا جواب یہ دینے لگے کہ جہاد تو صرف اپنے دفاع میں لڑی جانے والی جنگ ہے، اسلام میں اقدامی جہاد نہیں ہے۔ اِس حقیقت سے اُنہوں نے بچنا چاہا کہ جہاد کفار کے خلاف ایک جنگ ہے کیونکہ یہ اسلام سے انکار کرنے والے ہیں۔ اُنہوں نے قضاء و قدر کا یہ کہہ کر دفاع کیا کہ اسلام نے اِس موضوع پر بحث کرنے سے منع کیا ہے، اِس طرح اُنہیں بے عملی اور بد عملی کی چھوٹ مل گئی۔ اُنہوں نے اِسطرح اسلام پر لگائے گئے الزامات کو قبول کر لیا۔ اُنہوں نے اسلام کا اِس طرح دفاع کیا کہ اِسے کفار کے مقابلہ میں شکست ہی سمجھا جائے گا۔ اِس شکست خوردگی اور ذلّت کا براہِ راست نتیجہ یہ نکلا کہ جن احکام پر بھی کفار حملہ آور ہوتے گئے، مسلمان اُن اسلامی افکار کے معاملے میں احساس کمتری کا شکار ہونے لگے اور اُن کی جگہ سرمایہ دارانہ افکار اور قوانین نے لے لی۔ جہاں تک اُن نئے معاملات اور مسائل کا سوال ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہیں اور اُسی معاشرے کے ساتھ خاص ہیں، اُن کے تعلق سے مسلمانوں نے اسلام سے حل تراشنا چاہا جبکہ یہ مسائل شروع سے نہ تو اسلامی نظام کی پیداوار ہیں اور نہ ہی یہ ایک اسلامی معاشرے میں پنپ سکتے ہیں۔ اب مسلمان یہ کہنے لگے کہ اسلامی نقطۂ

نظر سے مسلمانوں کو المصالح المرسلۃ کا اصول اپنانا چاہئے جس کی رو سے عام مصلحت اور فائدے کو ترجیح دی جاتی ہے، اللہ کا قانون اِس کی اجازت دیتا ہے۔ اِن کا یہ کہنا تھا کہ حکمت مومن کی کھوئی ہوئی میراث ہے جہاں بھی وہ اُسے پائے، حاصل کرلینا چاہئے۔ اِسکی بنیاد پر یہ کوشش کی گئی کہ سرمایہ دارانہ نظام جس طریقے سے مسائل کو حل کرتا ہے، اُسے اسلام کو بھی اختیار کرنا چاہئے۔ اِس کو اُنھوں نے اسلامی طریقہ سمجھ کر اختیار کیا جبکہ اسلام اِس ملاوٹ کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔ اِن کا کہنا تھا کہ اسلام میں بیمہ (Insurance) کرانے کی ممانعت نہیں ہے، اِسکا جواز یہ پیش کیا جاتا تھا کہ یہ تو ایک معاہدہ ہے۔ کچھ دوسرے لوگوں کا کہنا تھا کہ اِسکے حرام ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے اِسلئے یہ جائز ہے، کیونکہ ہر وہ چیز جو حرام نہیں ہے وہ مباح ہے، یہ بھی لوگوں کا کہنا تھا کہ بیمہ تو ایک طرح کی ضمانت ہوتی ہے اور اسلام اِسکی اجازت دیتا ہے۔ غیر ممالک سے تجارت کے بارے میں اُن کا کہنا تھا کہ جس کام میں بھی مسلمانوں کا فائدہ ہو وہ انہیں کرنا چاہئے۔ اِس طرح ریاست کو مسلمانوں کا مفاد پیشِ نظر رکھ کر اُس سے فائدہ اُٹھانا چاہئے، یہی المصالح المرسلۃ کا اصول ہے۔ اُنھوں نے پارلیمانی نظام کو یہ کہہ کر جائز قرار دیا کہ یہ تو شوریٰ ہے اور اسلام نے شوریٰ کی اجازت دی ہے۔ اُنھوں نے فرانسیسی دیوانی قوانین کو اپنایا جس میں دماغی حالت اور رجحان کی قانون سازی میں رعایت رکھی گئی ہے، اِس کا جواز یہ پیش کیا کہ اصل معاملہ متن کی روح کا ہے اور اس کا تعلق نیت سے جڑا ہوتا ہے۔ اسلام کی طرف سے اُنھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ اصول ہے کہ معاہدے میں اصل چیز اُسکے مقاصد اور معانی ہوتے ہیں نہ کہ اُس کے الفاظ

اور فقرے۔ اِس کے ثبوت کیلئے اُنہوں نے اِس حدیث کو پیش کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **(إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)** کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اِن کا یہ بھی دعویٰ رہا کہ اسلام عام آزادیاں لے کر آیا ہے اور لوگوں کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ اِن کا لحاظ رکھیں کیونکہ اسلام آزادی کا ہی مذہب ہے۔ وہ عیسائیوں کے اس نظریے کو ماننے لگے کہ روحانی پہلو تو روح ہے جو جسم سے مختلف ہوتی ہے اور آدمی روح اور مادّہ دونوں سے مل کر بنتا ہے۔ اِس طرح نہ تو روح کو جسم پر حاوی ہونا چاہیئے، اور نہ جسم کو روح پر۔ اِس طرح وہ کفار کے چیلنج کے سامنے الجھن کا شکار ہو گئے۔ اُنہوں نے مسائل پر غور نہیں کیا تاکہ وہ کتاب اور سنت کا مطالعہ کر کے اُن کے بارے میں صحیح حل نکالتے اور شرعی حکم معلوم کرتے، اِسکے بجائے اُنہوں نے مغرب کے بتائے ہوئے حل کو ہی اسلامی حل سمجھ کر دل وجان سے قبول کر لیا، محض اِس بنیاد پر کہ اسلام اِس حل کو صراحاً منع نہیں کرتا۔ کچھ لوگوں نے بعض اماموں کی رائے کو (المصالح المرسلہ) کے اصول کے تحت قبول کر لیا، نہ کہ قرآن و حدیث سے، جس کے کہ وہ پابند تھے۔ سرمایہ دارانہ قوانین کو اِس دعوے کے ساتھ متعارف کرایا گیا کہ یہ اسلامی احکام ہیں۔ اِس کے بعد اب یہ ناگزیر ہو گیا کہ معاشرے میں قوانین اور مسلمانوں کے معاملات اِس طرح چلنے لگے بغیر اِس کا لحاظ کئے کہ وہ اسلامی ہیں یا نہیں۔ اِس طرح سرمایہ دارانہ قوانین مسلمانوں میں جاری ہو گئے اور اسلام کو بھلا دیا گیا۔ جب اسلامی افکار کو بدلا گیا تو باآسانی اسلامی احساسات بھی تبدیل ہو گئے۔ اِس طرح اسلامی احکام کو اپنانے میں خود مسلمان کراہیت محسوس کرنے لگے کیونکہ اُنہوں نے اُسے مذہبی تعصب

اور شدّت پسندی سمجھا اور یہ بات مسلمانوں میں عام ہو گئی۔ اسلام سے بیزاری اِس حد تک بڑھ گئی کہ لوگوں کی نظر میں کفار اور مسلمانوں کے درمیان اور اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان کوئی فرق ہی باقی نہ رہا۔ سرمایہ دارانہ تصور لوگوں کے دماغ پر بری طرح چھا گیا اور اسلام کے تعلق سے اُن کا جوش و جذبہ ماند پڑ گیا۔ اب قرآن پاک پر کوئی حملہ ہونے کی شکل میں غصّے کا اظہار پسماندگی اور زوال کی نشانی سمجھا جانے لگا، کیونکہ اُنکے نقطۂ نظر سے یہ سب غیر جانبدارانہ علمی تحقیق کے وجہ سے ہو رہا تھا۔ اِس طرح اسلامی حمیّت اور جذبات بالکل ختم کر دئے گئے۔ اسلامی جذبہ و احساس صرف عبادات اور مخصوص معاملات جیسے کفن دفن وغیرہ تک محدود رہ گئے۔ سرمایہ دارانہ نظام اور اسلام کی مقابلہ آرائی میں یہ مسلمانوں کی زبردست شکست تھی۔ یہ اسلام کی تقریباً شکست ہی ہوتی، اگر وہ اسلامی افکار جن پر اتنے حملے کئے گئے تھے سچّے اور حق نہ ہوتے یا غلط ہوتے جیسا کہ حملہ آور ظاہر کر رہے تھے، یا پھر سرمایہ دارانہ افکار میں کچھ سچّائی ہوتی، اِسکے برعکس اسلامی افکار تو سراسر سچّائی پر مبنی اور حقیقت کے مطابق ہیں۔ ایسا ہی معاملہ اُن اسلامی احساسات کے ساتھ بھی ہوتا جن پر اتنے حملے کئے جارہے تھے اگر یہ آدمی کی فطرت کے مطابق نہ ہوتے تو آدمی اِنہیں قبول نہ کرتا۔ اگر معاملہ ایسا ہوتا تو یہ شکست محض مسلمانوں تک ہی محدود نہ رہتی اور اُن کے افکار کا اثر باہمی معاملات اور سیاسی صورتحال بدلنے پر رک کر نہ رہ جاتا بلکہ اِس شکست کے بعد کفار اسلام کا عقلی اور جذباتی وجود ہی ختم کر دیتے جس طرح کہ اُنھوں نے اِس کو سیاسی منظرنامہ سے ہٹا دیا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حقیقت اِسکے برخلاف ہے کیونکہ اسلام کے

خلاف سرمایہ دارانہ نظام کے تصادم میں شکست مسلمانوں نے کھائی نہ کہ اسلام نے۔ اِسی لئے سرمایہ دارانہ نظام اور کفر کے خلاف اسلام کا حملہ آج بھی اُسی طرح جاری ہے جس طرح اُس وقت جاری تھا جب اُنہوں نے کفر اور کفار کو شکست دی تھی۔ اسلامی افکار اور احساسات وہ عوامل ہیں جو باطل طاقتوں کے خلاف آج بھی نبرد آزما ہیں۔ اِنہی اسباب سے ہمیں امید ہے، یہی ہمیں ہمارے فتح کے دنوں کی یاد دلاتے ہیں اور اسلام کے احیاء کیلئے جدوجہد کی دعوت دیتے ہیں جو عین انسان کی فطرت کے مطابق ہے، یہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم اسلامی دعوت کو ساری دنیا میں پہنچائیں، اِس کو خواہش اور تمنّا سے آگے بڑھ کر حقیقت کا روپ دینے کی کوشش کریں۔

جہاں تک اسلامی افکار کے صحیح اور حق اور سرمایہ دارنہ افکار کے غلط اور باطل ہونے کی بات ہے تو یہ حقیقت اِن افکار سے ہی ظاہر ہے۔ اِس طرح سرمایہ دارنہ افکار جن کی رُو سے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا غلط ہے، جو یہ کہتے ہیں مرد کو صرف ایک بیوی پر ہی اکتفاء کرنا چاہئے۔ یہ صرف ایک نظریاتی بات ہے اِسکا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ کیا دنیا میں کہیں بھی ایسے معاشرہ کا وجود ہے جس میں ہر مرد کی صرف ایک بیوی ہو؟ دنیا میں ایسے کسی معاشرے کا وجود نہیں ہے جس میں ایسے مرد بالکل نہ ہوں جن کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں۔ فرق یہ ہے کہ جن عورتوں کو یہ اپنے پاس رکھتے ہیں، اُن میں کسی کو پارٹنر، کسی کو گرل فرینڈ اور کسی کو بیوی کا نام دیتے ہیں۔ وہ احکام جو تعدد ازدواج کی اجازت دیتے ہیں کہ کوئی مرد ایک، دو، تین یا چار تک بیویاں رکھ سکتا ہے، شریعت میں اُنکی حیثیت تسلیم کی جائیگی نہ کہ اُنہیں پارٹنر یا گرل فرینڈ بنا کر رکھنے کی۔ کیا یہ انسان کی

فطرت کے مطابق اِس مسئلے کا حل بتاتے ہیں؟ یا یہ تعددِ ازدواج کو فطرت کے مطابق سمجھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اِس سے مسئلہ حل ہو جائیگا؟ خاص طور سے جب یہ غیر قانونی طور پر ایک سے زیادہ عورتیں اپنے پاس رکھتے ہوئے اِس پر خاموشی اختیار کرتے ہیں، کیونکہ اِن کے قانون کی رو سے ایک سے زیادہ بیوی رکھ نہیں سکتے۔ یا یہ صحیح ہے کہ یہ اپنی مرضی سے شرعی طریقے اور فطرت کے مطابق زندگی گزاریں؟

ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

﴿فَإِمسَاكُۢ بِمَعرُوفٍ أَو تَصرِيحُۢ بِإِحْسَـٰنٍۗ﴾

”پھر عمدہ طریقے سے روک لیا جائے یا بھلائی کے ساتھ رخصت کر دیا جائے“۔(البقرۃ:2:229)

مرد اُس وقت تک ہی بیوی کو اپنے ساتھ رکھے جب تک اُن میں باہم محبت و الفت ہو اور اُن کی زندگی ہنسی خوشی اور سکون سے گزر رہی ہو، اگر اُن میں کسی وجہ سے نااتفاقی ہو اور اُن کا ساتھ میں رہنا دونوں کیلئے پریشانی کا باعث بن رہا ہو تو کیا ایسی حالت میں عورت کو طلاق دینا زوجین کے حق میں مفید نہ ہو گا؟ یا اُن کو زبردستی ساتھ رہنے پر مجبور کرنا جس سے کہ اُن کی زندگی اجیرن اور وہ خودکشی یا قتل پر مجبور ہو جائیں؟

حکومت کی حقیقت یہ ہے کہ امت کو اِس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ جس شخص کو مناسب سمجھے یہ ذمہ داری سونپ دے۔ اس اختیار کو استعمال کرنے والا اور احکام پر صحیح طریقے سے عمل

کرانے والا کوئی ایک شخص ہی ہو سکتا ہے، ایک سے زیادہ اشخاص کے ہاتھ میں اگر یہ اختیار دے دیا جائے تو پورا نظام درہم برہم ہو جانے کا خطرہ بنا رہے گا۔ تاہم یہ صاحبِ اختیار شخص بھی ایک مخصوص نظام کا پابند رہے گا جس کو وہ صحیح سمجھتا ہے، اِس کی بتائی گئی حدود سے باہر جانے کی اُس کو بھی اجازت نہ ہو گی۔ جو چیزیں اُس شخص کو کنٹرول میں رکھیں گی، اِس نظام پر اُسکا یقین جس کا وہ پابند ہے، مزید یہ کہ اُسکا تقویٰ اور ضمیر اسے حدود سے باہر نہیں جانے دے گا۔ اس سے بڑھ کر وہ امت جس پر وہ حکومت کر رہا ہے اور جس نے اُسے یہ اختیار دیا ہے اُسکے اِس اختیار کو غلط استعمال کرنے پر اس کا احتساب کرے گی، اسے زبانی طور پر سمجھایا جائیگا یا غلط کام کرنے کی شکل میں اُسے طاقت سے بھی روکا جائیگا۔ یہ اِس شرط کے ساتھ ہے کہ امت اُس کے کسی بھی حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتی چاہے وہ حکم فرض ہو، مندوب ہو یا مباح، لیکن کسی ناجائز یا گناہ کے کام میں وہ اُسکی اطاعت ہر گز نہیں کرے گی۔ یہ ہے خلافت کی حقیقت۔ کونسا نظام عملاً صحیح اور حقیقت پر مبنی ہے؟ نظامِ اسلام یا جمہوری نظام، جس کا دعویٰ ہے کہ قوم کو حکومت کرنے کا حق ہے؟ اس دعوے کا عملی نفاذ ناممکن ہے، اِسلئے یہ دھوکے اور فریب کے سوا کچھ نہیں، جمہوریت میں وزیرِ اعظم کو حکومت کے تمام اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور اُسکے وزراء اُسکے معاون ہوتے ہیں۔

اب جہاں تک جہاد کی بات ہے تو مسلمانوں کی طرف سے یہ صفائی پیش کرنا کہ جہاد تو دفاعی جنگ ہے، اپنے آپ میں اسلام پر ایک الزام ہے۔ یہ بات کہنا جہاد کی حقیقت سے ٹکراتا ہے جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے دور سے اسلامی ریاست کے خاتمے تک جاری رہا۔ مسلمان خود

کافروں سے جنگ کرنے میں پہل کرتے تھے اور اِس طریقے کو وہ اسلام کی تبلیغ کیلئے استعمال کرتے تھے۔ یہ مدافعانہ جواز قرآنِ حکیم کے بھی سراسر خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر اپنے کلامِ پاک میں یہ بات فرمادی:

﴿قَٰتِلُواْ ٱلَّذِينَ لَا يُؤۡمِنُونَ بِٱللَّهِ وَلَا بِٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ ٱلۡحَقِّ مِنَ ٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلۡكِتَٰبَ حَتَّىٰ يُعۡطُواْ ٱلۡجِزۡيَةَ عَن يَدٖ وَهُمۡ صَٰغِرُونَ﴾

”لڑو اُن سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، نہ روزِ آخر پر اور نہ اللہ اور اُسکے حرام ٹھہرائے ہوئے کو حرام قرار دیتے ہیں اور نہ دینِ حق کی پیروی کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اقتدار سے دست بردار ہو کر اور چھوٹے (ماتحت) بن کر جزیہ دینے لگیں“۔ (التوبہ؛ 9:29)

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ بھی فرمایا:

﴿قَٰتِلُواْ ٱلَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ ٱلۡكُفَّارِ وَلۡيَجِدُواْ فِيكُمۡ غِلۡظَةٗۚ﴾

”اِن کافروں سے لڑو جو تمہارے قریب ہیں، اور چاہئے کہ وہ تم میں سختی پائیں“۔ (التوبہ؛ 9:123)

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ حَرِّضِ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ عَلَى ٱلۡقِتَالِۚ﴾

”اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) مومنوں کو جہاد کی ترغیب دو“۔ (الانفال؛ 8:65)

یہ بات ثابت ہو گئی کہ جہاد کفار کے خلاف ایک مادّی جنگ ہے تا کہ اسلامی حکم کو قائم کیا جا سکے۔ کفار کے سامنے واضح طور پر اسلام کی دعوت پہنچانے کے بعد اگر وہ اِس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کریں تو پھر ایسے لوگوں کے خلاف جہاد کیا جائیگا۔ ہر عقیدہ اپنے پیروں کو یہی حکم دیتا ہے۔ اس عقیدہ کے حامل افراد مادی طاقت حاصل کرتے ہیں اور مزید یہ کہ اپنے ماننے والوں میں ایک فوجی روح اِس عقیدہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اِس عقیدے کی حامل قوم اِس مادی قوت کی بنیاد پر سیاسی جنگ اور سفارتی حکمتِ عملی کا نقشہ بناتی ہے تا کہ ایسے حالات پیدا کئے جا سکیں جن میں دعوت کا کام آسانی سے کیا جا سکے اور ریاست کی سیاسی حیثیت میں اضافہ کیا جائے۔ جب مادی تصادم ہوتا ہے تو لڑائی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ یہ صورتحال سرد جنگ کہلاتی ہے جب دو عقائد کو ماننے والے لوگ اپنے اپنے عقیدے کو پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی مسلح افواج لڑائی کی تیاری کرتی ہیں، یہی عمل ہر جگہ ہوتا ہے۔ اِسی طرح کی صورتحال جرمنی اور نام نہاد آزاد دنیا کے درمیان دوسری عالمی جنگ شروع ہونے سے پہلے پیدا ہو گئی تھی۔ اُس سے پہلے اسلام اور سرمایہ داری کے درمیان یہی صورتحال تھی۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں، یہ زندگی کی ایک حقیقت ہے کہ بہت سے افکار ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں۔ یہ افکار جب مادی شکل اختیار کرتے ہیں تو اِن کو پھیلانے کیلئے اور اِن کے دفاع کیلئے مادی طاقت استعمال کی جاتی ہے اور سیاسی، تمدنی، اقتصادی اور فوجی ذرائع بھی کام میں لئے جاتے ہیں۔ یہ ہے جہاد کی حقیقت۔ یہ وہ لڑائی ہے جو ایک عقیدے کی خاطر سیاسی اور تہذیبی ذرائع استعمال کرنے کے بعد مادی طاقت کے سہارے لڑی جاتی

ہے۔ تاہم یہ اسلامی فوج یا جہاد کی روح جرمن فوج کی طرح نہیں ہے جو ایک ایسی فوجی طاقت ہے جس کا مقصد جرمن قوم کو باقی لوگوں سے بالاتر مقام دلانا ہے بلکہ یہ ایک ایسی فوجی طاقت ہے جو اسلامی دعوت کے سامنے آنے والی رکاوٹوں کو دور کرتی ہے تاکہ لوگ آسانی سے اسلام قبول کر سکیں اور باقی مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک ایسی امت تشکیل دیں جس میں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر کوئی برتری حاصل نہیں سوائے تقویٰ کی بنیاد کے۔

القضاء والقدر، اِن دونوں الفاظ کے معنی وہ اعمال ہیں جو انسان کی مرضی کے خلاف واقع ہوتے ہیں اور آدمی جن واقعات کے کنٹرول میں ہوتا ہے اور جن کے پیچھے ایک مقصد کارفرما ہوتا ہے۔ جہاں تک لفظ قدر کے متعین معنی کا سوال ہے تو اِس کا مطلب ہے اللہ کا علم۔ اِسکا کوئی تعلق آدمی کے اختیاری عمل سے نہیں ہوتا جس کا اُسے اللہ کے سامنے حساب دینا ہے جیسا کہ دنیا میں اُس کا احتساب ریاست، والدین اور اُسکے سرپرستوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ اِس میں قسمت کا بہانہ کہاں سے مل گیا؟ جب اس فہم کے ساتھ مسلمانوں نے دنیا کو فتح کیا اور دوسری قوموں کو زیر کیا تو اِس میں شکست خوردگی یا استسلام(Fatalism) کہاں تھا جس کو آج مسلمان قسمت(Luck) کے مغربی تصور سے منسوب کرتا ہے۔ مزید یہ کہ اس تصور کا حامل شخص مجبور ہوتا ہے کہ وہ مطالعہ اور تحقیق کرے اور کوئی بھی عمل کرنے سے پہلے یہ معلوم کرے کہ اِسکے بارے میں شرعی حکم کیا ہے کیونکہ اسے انجام دینے کے بعد ہمارا احتساب ہوگا اور اُسی کے مطابق اِس عمل پر عذاب وثواب کا فیصلہ ہوگا۔ ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ ایسا کوئی کام واقع ہوگیا جو ہمارے

دائرہ اختیار سے باہر تھا جس میں ہماری مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا اور جس سے ہمیں فائدہ ہو یا نقصان، دوسرے الفاظ میں بظاہر اِس میں خیر نظر آئے یا شر، اُسے اللہ کی مرضی سمجھ کر ہمیں دل سے قبول کرنا چاہئے، اِس پر قناعت کرنا چاہئے اور اِس پر فکرمند اور پریشان نہیں ہونا چاہئے، ہمارا یہ رویہ اُن کاموں کے تعلق سے ہونا چاہئے جو ہمارے کنٹرول اور دائرہ اختیار سے باہر ہیں اور جن کا ہم کچھ علاج بھی نہیں کرسکتے۔ اِس کے علاوہ جو کام ہمارے دائرۂ اختیار میں آتے ہیں اُن کے بارے میں ہمیں بہت محتاط رہنا چاہئے کیونکہ اِن پر ہماری بازپرس ہوگی۔ اپنے اعمال کو جانچنے کا یہی ناگزیر اور عملی طریقہ ہے جس سے کہ ہم اعلیٰ اقدار کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔ یعنی جو کام ہمارے اختیار اور مرضی کے دائرے سے باہر ہیں، اُنہیں اللہ کی مرضی سمجھتے ہوئے دل سے قبول کرلیا جائے اور جو کام ہمارے دائرہ اختیار میں آتے ہیں اور جنہیں ہم اپنی مرضی اور ارادے سے کرتے ہیں، اُن کو انجام دینے سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہئے کہ اِس میں شرعی حکم کیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کو اپنے اختیاری اعمال کا ہی حساب دینا ہے اور وہ اعمال جو اسکے اختیار کے باہر کے ہیں، اُن پر اِسکی کوئی ذمہ داری نہیں ہے کیونکہ وہ اِس معاملے میں بے بس ہے۔ یہ تصور اور سوچنے کا طریقہ اللہ تعالیٰ کا انسان پر بہت بڑا انعام ہے کیونکہ اِس طرح انسان اپنی زندگی بہت اطمینان اور یکسوئی سے گزار سکتا ہے۔ اس سے انسان کو دو بہت بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں، ایک یہ کہ وہ کام جو قضا یا تقدیر کا حصہ ہیں اُن پر غور و فکر میں انسان اپنا دماغ نہیں کھپاتا اور پریشان نہیں ہوتا، انہیں اللہ کا فیصلہ سمجھ کر دل سے قبول کرتا ہے، اِن پر قانع اور شاکر رہتا

ہے۔ اِس سوچ سے اُس کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے یہاں اسکے درجات بلند ہوتے ہیں۔ اِس سوچ سے کہ جو کام بھی اللہ کی مرضی سے ہو رہا ہے اس میں ہمارے لئے خیر ہی خیر ہے، اِس سے ہمیں بڑا سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ کہ جو کام ہمارے اختیار میں ہیں اُن کے بارے میں انسان بہت تعمیری اور مثبت انداز میں سوچتا ہے۔ ہر کام کو انجام دینے سے پہلے وہ یہ سوچتا ہے کہ اِس کے بارے میں اللہ کا حکم کیا ہے؟ اِس طرح ہر کام کو اللہ کے اوامر ونواہی کے مطابق کرنے سے اسے دنیا میں بھی مزید نیک اور اچھے کام کرنے کا حوصلہ ملتا ہے اور نتیجتاً آخرت میں بھی وہ زیادہ سے زیادہ ثواب کا مستحق ہوگا۔ قضاء وقدر کے بارے میں یہ سوچ انسان کے اندر یہ عظیم الشان صفات پیدا کرتی ہے۔

یہ ہے اِن اسلامی افکار کی حقیقت جنہیں کافر استعمار نے انسانوں کیلئے ایک مسئلہ بنا کر پیش کیا۔ یہ اُن سرمایہ دارانہ افکار کی بھی حقیقت ہے جن کے ذریعہ اسلام کے اِن پاکیزہ افکار کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس حقیقت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جن افکار پر حملے کئے جارہے ہیں وہ کتنے کھوکھلے اور جھوٹے ہیں۔ اِن سچے افکار کے حامل افراد کی ذہنی کمزوری جسکی وجہ سے اُنہیں اِن افکار کو سمجھنے میں دقت ہو رہی ہے یا وہ اُس کی وضاحت نہیں کر پا رہے ہیں یا وہ اِن پر تنقید سے متاثر ہو رہے ہیں سے یہ مطلب نہیں نکالا جاسکتا کہ اِن افکار میں کوئی کمی ہے، اور باطل افکار کے حامل افراد کی خوش بیانی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُن کے افکار سچے ہیں اور نہ جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی ان کی غیر معمولی صلاحیت اِن باطل افکار کو صحیح کر دے گی۔ بلکہ حقیقی افکار تو وہی ہونگے جنہیں انسان کی

فطرت قبول کرے اور جو حقیقت کے بھی مطابق ہوں۔ دوسرے الفاظ میں سچ وہ ہے جو حقیقت کے مطابق ہو اور باطل وہ ہے جو حقیقت کے خلاف ہو۔ اسلئے اصل چیز افکار اور اُن کی حقیقت ہوتی ہے نہ کہ اُسکے حامل افراد، چاہے وہ اِن افکار کو پر زور طریقے سے پیش کریں یا نہ کر پائیں۔ مثال کے طور پر کمیونسٹ کہتے ہیں کہ افکار دماغ پر مادے کا عکس ہوتے ہیں۔ اِسکا مطلب ہے دماغ پر مادے کا فہم ہی حقیقت کا تصور ہے اور اسی سے کوئی شخص کسی چیز کا ادراک کرتا ہے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو اُسے حقیقت کے مطابق ہونا چاہئے اور اگر یہ حقیقت کے مطابق نہیں ہے تو ظاہر ہے یہ غلط ہے۔ جب انسان کسی چیز پر حملہ یا تنقید کرے، تو یہ طے کرتے وقت کہ یہ صحیح ہے یا غلط نہ تو ہم ناقد یا حملہ آور کی خوش بیانی کو کوئی دلیل مانیں گے اور نہ اُسکی عدم صلاحیت کو کوئی وزن دینگے کہ یہ اپنی بات اچھی طرح کہنے سے قاصر ہے بلکہ جو بات وہ کہہ رہا ہے اُسکی حقیقت پر ہم غور کرینگے۔ حزب التحریر نے کمیونسٹوں کے اِس خیال پر سخت تنقید کی اور کہا کہ فکر کی یہ تعریف دو زاویوں سے غلط ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ دماغ کے اوپر مادے کا اصلاً کوئی عکس ہی نہیں پڑتا۔ کیونکہ مثلاً جب کسی چیز پر روشنی کا عکس پڑتا ہے تو یہ اُس سے ظاہر ہوتا ہے جیسے دیوار پر لیمپ کی روشنی کا عکس وغیرہ۔ ایسا کچھ کسی مادے میں نہیں ہوتا نہ تو دماغ کا عکس مادے پر ہوتا ہے اور نہ مادے کا عکس دماغ پر۔ بلکہ ہمارے حواس میں سے کسی حس کے ذریعہ اسے محسوس کیا جاتا ہے اِس طرح یہ عکس نہیں بلکہ حواس کے ذریعہ اس کا احساس ہے، یہ کسی چیز کو چھونے، سونگھنے، چکھنے یا سننے سے ثابت ہو جاتا ہے۔ جہاں تک آنکھوں سے دیکھنے کی بات ہے تو یہ

ایک بحث کا موضوع ہے، یہ انعکاس(Reflection) نہیں یہ تو اصل میں انعطاف(Refraction) ہوتا ہے۔ روشنی آنکھ میں منعطف(Refract) ہونے سے پردۂ چشم (Retina) پر کسی چیز کی شبیہ بنتی ہے، یہ باہر منعکس(Reflect) نہیں ہوتی۔ یہ احساس ہونے کا طریقۂ عمل ہے نہ کہ انعکاس کا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ کمیونسٹوں نے ”فکر“ کی جو تعریف بتائی وہ کتنی غلط ہے۔ اِسی لئے کمیونسٹوں کی یہ بچگانہ فکر ایک صحیح فکر کے سامنے ٹِک نہیں پائی۔ دوسرے زاویہ سے بھی دیکھیں تو کسی چیز کے صرف احساس سے اُس چیز کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ اِس سے تو صرف احساس پیدا ہوتا ہے، اِس سے فرق نہیں پڑتا کہ یہ احساس کتنے قسم کا ہوتا ہے۔ کسی چیز کے بارے میں کوئی فکر دماغ میں آنے سے پہلے اُس چیز کے بارے میں پہلے سے کچھ معلومات ہونا ضروری ہے اِس سے ہی اُس چیز کی حقیقت ظاہر ہوگی۔ بغیر سابقہ معلومات ( Previous Information) کے کسی چیز کے بارے میں ادراک نہیں کیا جا سکتا، وہ تو صرف احساس ہو گا اسکے علاوہ کچھ نہیں۔ اصل میں کوئی شخص کسی حقیقی چیز کے بارے میں صرف محسوس کر سکتا ہے، محسوس کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اِس چیز کا اُسے ادراک ہو گیا کیونکہ اُس چیز کے تعلق سے اپنی پوزیشن کوئی طے نہیں کر سکتا سوائے اِس کے کہ جب وہ اِس کا تعلق اپنی جبلّت اور جسمانی ضروریات سے نہ جوڑے یا جب تک وہ اِس کا تعلق حقیقت کی بدلی ہوئی شکل سے نہ قائم کرلے۔ اسکے علاوہ کسی بھی چیز کی حقیقت کو جاننے کیلئے کہ اُسکے ساتھ اِسکی پوزیشن کیا ہوگی وہ معلوم نہیں کرسکتا۔ ایک سے زیادہ یا مختلف احساسات کے ذریعہ کسی چیز کو جانچنے پر ہی کوئی شخص

سمجھ سکتا ہے کہ فلاں چیز کھانے کی ہے یا نہیں، اِسے استعمال کرنے سے تکلیف ہو گی یا مزا آئے گا یا یہ کہ اُسکی شکل میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ یہ سب حیوانات کیلیۓ بھی ممکن ہے جس طرح کہ آدمی کیلیۓ ممکن ہے، اِن میں سے کوئی بھی چیز ادراک یا فکر نہیں کہلائے گی۔ بلکہ یہ صرف احساس ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔ جب تک اِس کا تعلق جبلت سے نہ جوڑا جائے، مثلاً چٹان کا ایک ٹکڑا، چاہے کتنی ہی دفعہ اس کو محسوس کیا جائے اسکی ماہئیت سمجھ میں نہیں آئیگی، وہ تو اسکی بدلی ہوئی شکل ہے جو سمجھی جاتی ہے۔ ایک احساس کے ساتھ اسکے بارے میں جب اطلاع دی جائیگی اُسی وقت اِس چیز کے بارے میں فہم یا ادراک پیدا ہو گا۔ اس کی سادہ سی مثال ایجادات کے معاملے سے ہے۔ ایجادات تجربوں (Experiments) سے ہوتی ہیں جن میں پہلے کی معلومات(Previous Information) کو شامل کرتے ہیں۔ بغیر معلومات کے کوئی بھی چیز ایجاد نہیں ہو سکتی۔ معلومات سے ہمارا مطلب حقیقت کے بارے میں معلومات نہیں بلکہ وہ معلومات جن کے ذریعہ حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ نتیجتاً اِس تعلق سے بھی کمیونسٹوں کی یہ تعریف(Definition) غلط ہے۔ اِس طرح کمیونسٹوں کا یہ خیال قابلِ التفاء نہیں رہ جاتا، اور یہ بالکل واضح ہو گیا کہ حقیقت سے متضاد ہونے کی وجہ سے فکر کے عکس ہونے کا نظریہ غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حزب التحریر نے کمیونسٹ خیال کو جھوٹ ثابت کرنے کے بعد فکر کی تعریف یہ متعین کی کہ یہ حقیقت کا احساس کے ذریعہ دماغ تک منتقل ہونا ہے اور سابقہ معلومات ( Previous Information) کو اِس پر منطبق کرنے سے حقیقت کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ

میں اس کے لئے دماغ، احساس، شئے اور پہلے سے اُسکے بارے میں معلومات سے فکر پیدا ہوتی ہے یعنی کسی شئے کو اِس طرح سمجھا جاسکتا ہے، یہ اُن کے لئے ہے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اس طرح کمیونسٹ فکر پر حملہ کرکے اس کو باطل ثابت کیا گیا، کیونکہ اِسکا دعویٰ حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اسلامی فکر ہی صحیح فکر ہے جس سے کمیونسٹ فکر پر حملہ کیا گیا کیونکہ یہ حقیقت کے عین مطابق ہے۔ اِس معاملہ میں حزب التحریر کی فکر نے کمیونسٹ فکر کو بری طرح شکست دی۔ مثال کے طور پر ہم ایک اور معاملے کو لیتے ہیں، سرمایہ دارانہ فکر معاشرے کی تعریف یہ بتاتی ہے کہ یہ افراد کے ملنے سے وجود میں آتا ہے یعنی فرد، فرد اور فرد مل کر ہی معاشرہ بناتے ہیں۔ اِس طرح اُن کی نظر میں معاشرہ افراد کا ایک گروہ ہوتا ہے جو باہم جمع ہونے سے بنتا ہے۔ اگر یہ فکر صحیح ہے تو اس کو حقیقت کے مطابق ہونا چاہئے اور اگر یہ حقیقت سے میل نہیں کھاتی تو یہ فکر غلط ثابت ہو جائیگی۔ جب اِس فکر پر حملہ کیا گیا اور تنقید کی گئی تو اِسی بنیاد پر کی گئی۔ حزب التحریر نے اِس فکر پر حملہ کیا اور کہا کہ معاشرے کی یہ تعریف غلط ہے کیونکہ افراد کے ملنے سے ایک گروہ بنتا ہے معاشرہ نہیں۔ جب لوگوں کے درمیان دائمی رشتہ استوار ہوتا ہے تو اِس سے معاشرہ بنتا ہے، اگر لوگوں کے درمیان کوئی دائمی رشتہ نہیں ہے تو اُسے معاشرہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان لوگوں کی حیثیت سفر کے ساتھی سے زیادہ نہیں ہے، ہر ایک اپنی اپنی منزل کی طرف جارہاہے جہاں وہ جانا چاہتا ہے۔ مثلاً ایک گاؤں کے رہنے والے لوگ باہم مل کر معاشرہ بناتے ہیں کیونکہ اُن میں ایک دائمی رشتہ ہے۔ اِس طرح سرمایہ داروں کی بتائی گئی تعریف غلط ہے

کیونکہ افراد کے ایک گروپ میں اگر کوئی دائمی رشتہ نہیں ہے جو اُن کے درمیان پیدا ہوا ہو چاہے وہ کسی بھی قسم کا ہو تو اِس گروپ کو معاشرہ نہیں کہا جا سکتا۔ اِس طرح معاشرے کے تعلق سے سرمایہ دارانہ فکر غلط ثابت ہو گئی کیونکہ یہ حقیقت کے مطابق نہیں ہے۔ اب معاشرے کی تعریف کیا ہو گی؟ اسے سمجھنے کیلئے گہرے مطالعے کی ضرورت ہو گی۔ افراد کے درمیان رشتہ اُنکے باہمی مفاد کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، یعنی یہ افراد کا باہمی مفاد ہے جس سے اُن کے درمیان رشتہ پیدا ہوتا ہے۔ کسی بھی معاملے میں افراد کے افکار آپس میں ملنا ضروری ہے جس سے اُن کے مفاد وابستہ ہوں، اِسی بنیاد پر اُنکے درمیان ایک رشتہ قائم ہوتا ہے۔ کسی بھی معاملے میں اُن کی مرضی، اُن کا غصہ، اُن کی خوشی اور اُن کا غم بھی یکساں ہونا چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں رشتہ قائم ہونے کیلئے اُن کے جذبات باہم ملنا چاہیئے۔ اِس رشتے کے قیام کیلئے اِس نظام کا بھی ہونا ضروری ہے جس کے ذریعہ یہ افراد اپنے مفاد کی تکمیل کر سکیں۔ جب مفاد کے تعلق سے سوچ مختلف ہو جاتی ہے، یعنی کوئی اُسے اپنے مفاد میں سمجھتا ہے اور کوئی اسے مفاد کے خلاف، یا جب لوگوں کے جذبات مختلف ہو جاتے ہیں یعنی کسی معاملے میں کچھ لوگ خوش ہیں اور کچھ ناراض، یا اگر نظام میں اختلاف ہے یعنی کوئی اُسے مخصوص نظام سے حل کرنا چاہتا ہے اور دوسرا کوئی اور نظام چاہتا ہے۔ اِن عناصر میں سے کسی میں بھی یعنی افکار، جذبات اور نظام میں افراد کے درمیان اگر کسی معاملے میں اختلاف پایا جاتا ہے تو ایسی صورتحال میں ان کے درمیان کوئی رشتہ نہ ہو گا۔ اِس طرح حزب التحریر نے معاشرے کے تعلق سے سرمایہ دارانہ فکر کی بتائی ہوئی تعریف کو بالکل غلط ثابت کر کے معاشرے

کی صحیح تعریف متعین کی، یعنی افکار، جذبات اور نظام کے مجموعے کو معاشرہ کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں افراد کے یکساں مفاد کی خاطر اُن کے افکار، جذبات اور نظام کے مجموعے سے جو رشتے قائم ہوتے ہیں اُس سے معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اِس فہم کے ساتھ سرمایہ دارانہ فکر پر حملہ کیا گیا اور اُس کی غلطی کو اُجاگر کیا گیا کیونکہ یہ حقیقت سے ٹکراتا ہے اور یہ واضح ہو گیا کہ جس فکر سے اِس پر حملہ کیا گیا وہ صحیح ہے کیونکہ یہ حقیقت کے عین مطابق ہے۔ اِس طرح حزب التحریر کی فکر نے سرمایہ دارانہ فکر کو باطل ثابت کر دیا اور اِسی طرح دوسرے افکار کو بھی۔ اگر وہ فکر صحیح ہوتی جس سے سرمایہ داروں نے اسلام کو چیلنج کیا تھا تو اِس صورت میں اسلام کی شکست ہوتی نہ کہ مسلمانوں کی۔ لیکن جس فکر سے مسلمانوں نے اسلام کو کمتر سمجھا وہ حقیقت کے مطابق نہیں تھی اور وہ اسلامی فکر جس پر اُنہوں نے حملہ کیا، وہ تو واقعتاً حقیقت کے عین مطابق ہے۔ اِس طرح سچّی اسلامی فکر کو جھوٹی فکر سے چیلنج کیا گیا لیکن سچّائی کے حاملین اِس سے واقف نہیں تھے، مزید یہ کہ اُنہوں نے اِس کے لئے زیادہ عقل بھی نہیں لگائی۔ اِس طرح مسلمانوں کو شکستِ فاش سے دوچار ہونا پڑا۔

یہ تھے کچھ اسلامی افکار اور احکامات جن پر سرمایہ دارانہ افکار و احکام حملہ آور ہوئے۔ جہاں تک اسلامی شریعت پر حملے کی بات ہے تو اِس کے لئے اُنہوں نے نئے نئے مسائل اُٹھائے، ایسے مسائل جو صرف سرمایہ دارانہ معاشرہ کی دین ہیں، اِس سے یہ ظاہر کرنا چاہا کہ شریعتِ اسلامی اِن جدید مسائل کو حل کرنے کی اہل نہیں ہے۔ بحث و مباحثے کا مغربی انداز یہ ہوتا تھا کہ وہ کسی بھی مسئلے

کے حل کیلئے سرمایہ دارانہ نظام کی رائے پیش کرتے تھے یہ کہہ کر کہ اسلام میں اس حل کا کوئی وجود نہیں ہے یا اسلام یہ رائے نہیں رکھتا۔ اِس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ اسلامی قانون میں ذرا بھی لچک نہیں ہے اور یہ زمانے کا ساتھ نہیں دے پاتا اور یہ اُن مسائل کو حل کرنے سے قاصر ہے جو زمانے کی ترقی کے ساتھ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اسلام سود خوری کی اجازت دینے میں ناکام ہو گیا جب کہ وقت ایسا آ گیا ہے کہ اُس کی ضرورت ہے۔ یہ بیمہ کے بارے میں بھی کوئی ضابطہ بتانے سے قاصر ہے اس حقیقت کے باوجود کہ تجارت و صنعت جو کہ اس زمانے کی پیداوار ہیں، اِن کو بیمہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ اسلام اس معاملہ میں بھی رہنمائی نہیں کر سکتا کہ موجودہ زمانے کے حساب سے ملکوں کے درمیان تجارت کے کیا اصول ہوں۔ اِس وجہ سے کسی ملک یا نظام کی قانون سازی کیلئے اسلام موزوں نہیں ہے جو جدید زمانے کے پیدا شدہ مسائل کو حل کرے۔ یعنی یہ ناگزیر ہے کہ زمانہ کی ترقی کے ساتھ ہی نئے مسائل سامنے آئیں گے اور اسلام میں اِن کا کوئی حل نہیں ہے۔ یہ بحث کی بنیاد تھی جو مغرب نے مسلمانوں کے سامنے رکھی اور اسلام کو چیلنج کیا۔ مسلمانوں نے بھی اسی بنیاد پر بحث و مباحثہ شروع کر دیا، اسی وجہ سے وہ الجھن کا شکار ہو گئے ۔ بلکہ یہاں الجھن اسی بات سے پیدا ہوئی کہ مسلمانوں نے اُن لوگوں سے بحث و مباحثہ اُنہی کی بتائی ہوئی بنیادوں اور فروع سے ہم آہنگی کرتے ہوئے جاری رکھا۔ جب بحث کی بنیاد ہی میں اختلاف تھا تو معاملہ تو الجھنا ہی تھا۔ جبکہ مسلمانوں کو شروع سے اِس بنیاد و سطح پر بحث کرنا ہی نہیں چاہئے تھا بلکہ بحث کی بنیاد یا سطح یہ ہونا چاہئے تھی کہ کیا اسلامی شریعت اِس کی اہل ہے کہ وہ لوگوں

کے باہمی معاملات کے تعلق سے پیدا ہونے والے تمام مسائل کو حل کر سکے؟ کیا اسلامی شریعت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ انسانی زندگی کے وسیع معاملات کو اتنا عام کر دے کہ منطوق اور مفہوم کیلئے یہ ممکن ہو جائے کہ وہ اپنے دلائل سے جدید پیش آمدہ متنوع مسائل کا احاطہ کر لے تاکہ اُن پر شرعی احکام کا انطباق ہو سکے؟ کیا اِس میں اتنی صلاحیت ہے کہ اجتماعی اصول اور عمومی افکار کیلئے اپنے اندر وسعت و گنجائش رکھے؟ کیا یہ اس کی اہل ہے کہ یہ مختلف پس منظر والے اور مختلف قومیتوں کے لوگوں کے مسائل کو حل کر سکے؟ اگر ایسا ہے تو شریعت موزوں ہے ورنہ نہیں۔ اِس بات کو ثابت کرنے کیلئے جدید مسائل کو شریعت کے سامنے رکھنا چاہیئے اور اُس سے اِن مسائل کا حل معلوم کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ شریعت کی نص (Text) کا مطالعہ ہونا چاہیئے تاکہ اس کی جانچ ہو سکے کہ اس سے شرعی اصول اور احکام مستنبط کئے جاسکتے ہیں یا نہیں جن کے تحت مختلف مسائل کا حل نکالا جاتا ہے۔ بحث کی بنیاد در حقیقت یہ ہونا چاہیئے تھی۔ جہاں تک اِس توقع کی بات ہے کہ شریعت ایسی کوئی رائے دے جو عوام کی اکثریت چاہتی ہے اور جو اِس زمانے میں رائج ہیں اور جن کی وکالت سرمایہ دارنہ نظام کرتا ہے، یہ بحث کی کوئی بنیاد نہیں ہے اور نہ اس کی اجازت ہے کیونکہ موضوعِ بحث یہ ہے کہ آیا شریعت موجودہ زمانے اور ہر زمانے کیلئے موزوں ہے یا نہیں اور اُس میں وقت کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت ہے یا نہیں اور اِن مسائل کیلئے شریعت کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ اِسلئے مغربی قانون سازی کے ماخذ اور اُس بنیاد کا مطالعہ کیا جائے جس پر یہ قائم ہے۔ مطالعہ کرتے وقت یہ دیکھنا ہو گا کہ یہ خود اپنی بنیاد سے جڑے رہتے ہوئے ہر زمانے

کے مسائل کو حل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں یا نہیں؟ یا یہ اپنے ماخذ سے حل کرنے کے بجائے اُس سے انحراف کرتے ہوئے، جوڑ توڑ کر کے اُسکی تاویل و تشریح کرتے ہیں۔ اب اسلامی قانون سازی کا مطالعہ کیا جائیگا کہ یہ اپنی بنیاد اور ماخذ سے جڑے رہتے ہوئے اور بغیر اُس سے انحراف کئے ہوئے ہر زمانے اور وقت کے مسائل کو حل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے یا نہیں۔ اِس سے صحیح اور غلط قانون سازی کی حقیقت کھل کر سامنے آجائیگی۔ صحیح قانون سازی تو وہ ہے جس کی بنیاد صحیح ہو اور جو حقیقت اور فطرت سے مطابقت رکھتی ہو۔ یہ جانچنے کیلئے کہ یہ صحیح ہے یا غلط، اس کی بنیاد حتمی اور فیصلہ کن ہونا چاہئے نہ کہ گمان اور ظن پر۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ ہر زمانے، ہر طرح کے لوگوں اور ہر نسل کیلئے موزوں ہے کیونکہ اِس میں یہ اہلیت بدرجۂ اتم موجود ہے کہ یہ انسان کے ہر مسئلہ کو ہر زمانے میں حل کرتا ہے چاہے وہ کسی بھی جگہ کا رہنے والا ہو۔ دوسرے الفاظ میں یہ ایسے وسیع خطوطِ رہنمائی فراہم کرتا ہے جن کے ذریعہ اِس بنیاد سے انحراف کئے بغیر، جس پر یہ قانون سازی قائم ہے، ہر مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی انسانی مسئلہ کے حل کیلئے اِن وسیع خطوطِ رہنمائی سے باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی جن سے مسئلہ کا حل نکالا جا رہا ہے۔ اگر قانون سازی اِن شرائط پر پوری اتر رہی ہے تو یہ ہر زمانے کیلئے موزوں ہیں۔ اگر یہ حل بتانے سے قاصر ہے اور اس کے لئے جوڑ توڑ اور اُلٹی سیدھی تشریح سے کام لیا جاتا ہے اور یہ اپنی بنیاد اور وسیع خطوطِ رہنمائی سے بھی انحراف کرتی ہے تو یہ ایک مخصوص قانون سازی ہوگی جو کچھ مخصوص لوگوں کے لئے اور مخصوص زمانے تک محدود ہوگی۔ یہ انسانیت کیلئے موزوں نہیں

ہو گی۔ یہ اُن لوگوں کیلئے بھی موزوں نہیں ہو گی سوائے کچھ معینہ مدت کیلئے، اس کے بعد اس کی موزونیت ختم ہو جائیگی، لوگ اس کو بدل دینگے اور اس کی جگہ دوسرا قانون بنالیں گے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پیش آیندہ مسائل کو اسلام کے سامنے مسئلہ کی حقیقت کو سمجھتے ہوئے پیش کرنا چاہئے نہ کہ اُسکے بارے میں سرمایہ دارانہ نظام کی رائے سامنے رکھ کر مسئلہ کو سمجھا جائے۔ اب یہ جانچا جائے گا کہ اُس کے وسیع خطوطِ رہنمائی کے اندر رہتے ہوئے اور اِس بنیاد کو چھوڑے بغیر جس پر اسلام قائم ہے، مسئلہ کا حل نکالا جاسکتا ہے یا نہیں۔

جو شخص بھی مغربی قوانین کا جائزہ لے گا، اِس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اِن کی بنیاد ہی غلط ہے، اِن کے بتائے ہوئے حل غلط ہیں اور یہ جدید دور کے پیش آمدہ مسائل کے حل بتانے سے قاصر ہیں، سوائے اِس کے کہ وہ اپنی بنیاد سے انحراف کریں، اِس سے ہٹ کر وہ ایسا حل بتائیں گے جس کا اُن کی بنیاد سے کوئی تعلق نہیں اور جو حقیقت سے بھی ٹکراتا ہو۔ جو شخص بھی اسلامی قوانین پر غور کرے گا، وہ یہ پائے گا کہ اِس کی بنیاد صحیح ہے، اِسکی ہر چیز متعین ہے اور یہ ظن و گمان پر مبنی نہیں ہے۔ اِس کا بتایا ہوا حل فطری اور حقیقت کے مطابق ہوتا ہے۔ اِسکے علاوہ یہ اپنی بنیاد سے انحراف کئے بغیر جس پر یہ قائم ہے اور اپنے وسیع خطوطِ رہنمائی میں رہتے ہوئے، دنیا میں ہر انسانی مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے۔

مغربی قانون سازی کی بنیاد ہی غلط ہے اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ دراصل حقوق (Rights) کی تعریف کیا ہے؟ اِن کے قانونی نظریات کی بنیاد جس پر یہ حقوق قائم ہیں وہی غلط ہے۔ اُن کے نزدیک حقوق کی تعریف ہی کچھ اور ہے۔ اُن کے مطابق حق کی تعریف یہ ہے کے "جو کام بھی مفاد میں ہو، جس سے مادی فائدہ حاصل ہو، اور قانون اُسے تسلیم کرتا ہو" اُسی کو حق کہیں گے۔ حق کے تعلق سے یہ فہم سراسر غلط ہے، اِسلئے اِس بنیاد پر قانون سازی بھی باطل ہے۔ اِس وجہ سے بھی یہ غلط ہے کہ حق کی اصلیت یہ نہیں ہے کہ وہ مفاد ہی حق ہے جس کی کوئی اقتصادی قیمت ہو، بلکہ حقوق تو "مطلق مفاد" ہیں۔ اِس کی مادی قیمت ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ حق کو صرف ایسے مفاد تک محدود کر دینا جس کی کوئی مادّی یا اقتصادی قیمت ہو، اس کے دو نتائج بر آمد ہونگے، پہلا یہ کہ اِس میں وہ مفاد شامل نہیں ہو گا جس کی کوئی مادی قیمت نہ ہو جیسے شادی اور طلاق وغیرہ جو ازدواجی حقوق ہیں اور اِس طرح کے تمام خاندانی حقوق۔ اِسی طرح اِس تعریف میں وہ مفاد شامل نہیں ہیں جن کی کوئی اخلاقی قیمت ہو، جیسے انسان کی عزت و وقار کا تحفظ، یہ ہر انسان کا حق ہے جبکہ اس کی کوئی اقتصادی قیمت نہیں ہوتی اور واقعتاً اِس کی اقتصادی قیمت پر غور کیا بھی نہیں جاتا۔ دوسرے یہ کہ کسی بھی چیز کی اقتصادی قیمت متعین کرنے کیلئے ایک پیمانے کی ضرورت ہوگی تاکہ اُس حق کا تعین کیا جاسکے۔ حق کو سمجھنا خود اُس کی قیمت ہے، اور ایسا کوئی پیمانہ حاصل کرنا ممکن نہیں ہے جس کے ذریعہ اُس حق کی قیمت معلوم کی جاسکے۔ اِس طرح حق کی یہ تعریف باطل قرار پاتی ہے۔

مغرب نے حقوق (Rights) کو دو خاص زمروں میں تقسیم کیا ہے: وہ حقوق جو شخصی معاملات کے ذیل میں آتے ہیں وہ شخصی حق (Right in Personam) کہلاتے ہیں اور دوسرے وہ حقوق جن کا تعلق شخص اور مال کے مابین ہو وہ حقِ عینی (Right in Rem) کہلائیں گے۔ سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے دو اشخاص یعنی مقروض اور قرض خواہ کے درمیان ربط یا بندھن کو شخصی حق کہا جائے گا۔ اِس کی تعریف یہ ہوئی کہ "دو اشخاص قرض خواہ اور مقروض کے درمیان تعلق جس کی رو سے قرض خواہ کا حق ہے کہ وہ مقروض سے اپنی چیز کا مطالبہ کرے یا اِس سلسلہ میں جو مناسب سمجھے کارروائی کرے"۔ حقِ شخصی ایک ذمہ داری ہے۔ اِسی بنیاد پر وہ معاملات جو کہ ذاتی معاملات کہلاتے ہیں انجام دیئے جاتے ہیں ۔ اِن میں سے کچھ معاملات اس طرح ہیں: رقوم کا تبادلہ، فروخت، اشیاء کا باہمی تبادلہ، شرکت، ہبہ، مصالحت، اجارہ داری، قرض، مختار نامہ، وقف (Endowment/Trust)، گروی یا رہن (Pawn) اور تحویل (Custody) وغیرہ۔ جہاں تک حق عینی کا سوال ہے، اِس نظر سے یہ کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ ایک اختیار ہے جو کہ قانون نے کسی مخصوص چیز پر دیا ہے۔ اِس کی تعریف اِس طرح کی گئی ہے "کسی مخصوص چیز پر کسی مخصوص شخص کو قانون کے ذریعہ دیا گیا مخصوص اختیار"۔ حقِ عینی کا تعلق رقوم سے ہے کسی شخص سے نہیں۔ حقِ عینی کے ذیل میں یہ معاملات آتے ہیں: حقِ ملکیت، ملکیت کو حاصل کرنے کے ذرائع، جائداد کا رہن اور زندگی کا بیمہ وغیرہ۔

حقوق کو اِس طرح تقسیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ حقِ عینی(Right in Rem)اور حقِ شخصی (Right in Personam) میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اِس تقسیم کی بنیاد پر ہوئے معاملات میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا۔ زمین کو پٹے پر دینے(Lease)اور رہن رکھنے میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ پٹے پر دینے کو حقِ شخصی اور رہن رکھنے کو حقِ عینی کے زمروں میں کیسے رکھا جا سکتا ہے جبکہ دونوں ہی معاملے دو لوگوں کے درمیان ہیں جن کا تعلق جائداد سے ہے۔ اِس کے علاوہ یہ تعریف منطقی مفروضوں پر مبنی ہے نہ کہ حقیقت کی بنیاد پر۔ اگر کوئی حقِ عینی کی یہ تعریف متعین کرے کہ "یہ مخصوص شخص کو مخصوص چیز پر قانون کے ذریعہ دیا گیا مخصوص اختیار ہے" اِس تعریف کی رو سے تو معاملہ ایک فرد اور ایک شئے کے درمیان ہوتا ہے نہ کہ دو افراد کے درمیان، حالانکہ حقیقتاً فرد اور چیز کے درمیان کوئی معاملہ ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ معاملہ دو افراد کے درمیان ہوتا ہے جس کا تعلق اُس چیز سے ہے۔ وہ معاملات جو حقِ عینی کے دائرے میں آتے ہیں جیسے جائیداد اور دولت کی ملکیت، منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کا رہن رکھنا اور زندگی کا بیمہ وغیرہ اِن سب سے ایک شخص اور دوسرے شخص کے درمیان معاملہ ظاہر ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔ اِس طرح دو اشخاص کے درمیان یہ معاملہ ہوتا ہے جس کا تعلق کسی چیز سے ہے نہ کہ کسی شخص اور چیز کے درمیان معاملہ۔ جہاں تک حقِ شخصی کی تعریف کی بات ہے، "یہ دو اشخاص یعنی قرض خواہ اور قرض دار کے درمیان معاملہ ہوتا ہے جس میں قرض خواہ کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ قرض دار سے اپنی چیز وصول کرے یا اُسکے خلاف مناسب کارروائی کرے"۔ اِس تعریف کا مطلب بھی یہ ہے کہ دو

افراد ایک معاملے میں بندھے ہوئے ہیں، اِن کے درمیان کوئی چیز موجود بھی ہو سکتی ہے اور نہیں بھی، تاہم حقیقت یہ ہے کہ دو افراد کے درمیان تعلق قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُن کے مابین ایسی کوئی چیز نہ ہو جس پر اُن کا حق بنتا ہو۔ اِس طرح اُن کا معاملہ اُس چیز کے تعلق سے ہے، اصل میں یہی تعلق کی بنیاد ہے۔ مزید یہ کہ یہ رشتہ یا تعلق جو ایک بندھن (Bond) کہلاتا ہے معاملے سے متعلقہ دونوں فریقوں کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ ایک دوسرے سے مطالبہ کریں بلکہ یہ صرف قرض خواہ کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ قرض دار سے مطالبہ کرے جبکہ دونوں فریقوں کو اپنا مطالبہ کرنے کا حق ہونا چاہئے۔ وہ معاملات جن کا تعلق شخصی حقوق سے ہے، جیسے کوئی چیز فروخت کرنا، اجارہ داری یا معاہدات، اِن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اِن میں تعلق کی بنیاد چیز ہے اور بغیر کسی چیز کی موجودگی کے نہ تو کوئی تعلق ہو گا اور نہ حق۔ اِس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ متعلقہ دونوں فریقوں کا یہ حق ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اپنی چیز کا مطالبہ کر سکتے ہیں تاہم مطالبہ کی نوعیت مختلف ہو گی۔ فروخت کرنے والا قیمت کا مطالبہ کریگا اور خریدار مطلوبہ چیز کا وغیرہ۔ اِس طرح حقِ عینی اور حقِ شخصی کی تقسیم کا کوئی مطلب نہیں ہے، دراصل یہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، کیونکہ معاملے کا تعلق کسی شخص سے ہے چاہے وہ تعلق کسی ایسے شخص سے ہو جس کے پاس کوئی چیز قابلِ فروخت ہے، یا اُس چیز سے ہو جس سے کوئی شخص جڑا ہو، مثلاً کوئی تحفہ، یا صرف چیز سے ہو جیسے خیراتی وقف وغیرہ۔ اِس طرح حقوق کی دونوں اقسام، حقِ شخصی اور حقِ عینی دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ رہن رکھنے اور ایجنسی (Franchise) جس کی نشاندہی حقِ عینی کی تحت کی گئی

ہے اور رقم کا تبادلہ، فروخت، کمپنی، اجارہ داری اور نمائندگی (Representation) جو کہ حقِ شخصی کے تحت آتے ہیں، میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ اصل معاملہ یا تو دو افراد کے درمیان ہے جس کا موضوع مال یا جائیداد ہے یا کسی شخص سے ہے جس سے جائیداد منسلک ہے یا تعلق صرف جائیداد سے ہے۔ یہ دراصل ایک ہی معاملے کی تین شکلیں ہیں۔ یعنی انسانی تعلقات کو منضبط کرنا۔ حقوق کی یہ تقسیم صحیح نہیں ہے۔

علاوہ ازیں مغربی قانون سازی کا اہم ترین جزو دیوانی قانون ہے یعنی تمام معاملات کے تعلق سے قانون سازی، چاہے وہ فرد اور اس کے خاندان کو منظم کرنے کا باہمی معاملہ ہو یا ایک فرد کا دوسرے فرد سے معاملہ ہو جس کا تعلق مال و جائیداد سے ہو۔ اسلامی قانون سازی کو دیوانی قانون کے تعلق سے ہی حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ مغرب نے جو دیوانی قانون بنایا ہے اُس کا لُب لباب یہ ہے کہ اِس کو حقِ عینی میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ حقِ شخصی کو ایک ذمہ داری بتایا گیا، اسی بنیاد پر نظریۂ التزام (Theory of Liability) وجود میں آیا۔ یہی تمام مغربی قوانین کا اصولِ قانون ہے چاہے وہ لاطینی تدوین (Latin Codification) ہو یا جرمن تدوینِ قانون۔ تمام مغربی قوانین کی بنیاد ہی نظریۂ التزام پر ہے۔ التزام کی مختلف تعریفیں بیان کی گئی ہیں، تمام ہی تعریفوں کا محور ذمہ داری (التزام) ہی ہے چاہے وہ مال و جائیداد کسی کو دینے کے تعلق سے ہو یا کوئی کارروائی کرنے یا نہ کرنے کے تعلق سے۔ ذمہ داری، التزام (Liability) کی تعریف اِس طرح کی گئی کہ

:

"یہ ایک معاہدہ ہے جس کے تحت ایک یا ایک سے زیادہ اشخاص دوسرے شخص یا اشخاص سے کسی چیز کو دینے، کسی کارروائی کے کرنے یا نہ کرنے کا عہد کرتے ہیں"۔

اِس کی یہ بھی تعریف کی گئی ہے کہ:

"یہ ایک قانونی معاملہ ہے جس کے تحت ایک فرد کو حقِ شخصی منتقل کرنے یا کارروائی کرنے یا نہ کرنے کا حق ہے"۔

جب اِن تصریحات کا حقِ شخصی (دو افراد یعنی قرض دار اور قرض خواہ کے درمیان معاہدہ جس کی رو سے قرض خواہ کو قرض دار سے اپنی کوئی چیز دے دینے یا اس کا مطالبہ کرنے، یا کارروائی کرنے یا نہ کرنے کا حق ہوتا ہے) کی مغربی تصریح سے موازنہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصل میں نظریۂ التزام (Theory of Liability) ہی حقِ شخصی (Right in Personam) ہے۔ اِس طرح یہ تیسرا درجہ ہی مغربی قانون سازی کی بنیاد بنتا ہے جہاں کہ سرمایہ دار پہلے تو حق (Right) کی تصریح کرتے ہیں، پھر اِس کو حقِ شخصی اور حقِ عینی میں تقسیم کرتے ہیں اور اگلے مرحلے میں حق شخصی کی بنیاد پر وہ نظریۂ التزام قائم کرتے ہیں اور اس کو مغرب میں تمام دیوانی قوانین کی بنیاد بناتے ہیں۔ اِس نظریے کو مغربی قانون سازی میں بہت اہم مقام دیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص مغربی علمِ قانون (Jurisprudence) اور مغربی قانون سازی (Western Legislation) کا گہرائی سے مطالعہ کرے تو اس کو اس نظریے کی اہمیت

سمجھ میں آئے گی۔ دیوانی قانون میں اِس نظریے کی اہمیت اور مقام ویسا ہی ہے جیسا انسان کے جسمانی ڈھانچہ میں ریڑھ کی ہڈی کا۔ اِس نظریے کے تضاد اور فریب کو سمجھنے کے بعد مغربی قانون سازی اور اُسکے قوانین کی غلطیوں، کھوکھلے پن اور فریب کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اِس سے یہ بات اور واضح ہو کر سامنے آئیگی کہ اِن فاسد اور کھوٹے قوانین کے سہارے یہ سرمایہ دار اسلامی شریعت، اُس کے خالص اور مقدس قوانین پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ اِن حملوں کے سامنے مسلمان شکست خوردہ ہو رہے ہیں۔

ہم پھر اُسی موضوع یعنی نظریہ التزام یا حقِ شخصی کی طرف لوٹتے ہیں۔ یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر کے مطابق التزام یا حقِ شخصی کی بنیاد قرض خواہ اور قرض دار کے قانونی تعلق کے اوپر ہے۔ اِس بندش یا معاہدے میں قرض دار اپنے قرض خواہ کو اپنے جسم پر پورا اختیار دیتا ہے نہ کہ اپنے مال و جائیداد پر۔ یہی فرق ہے حقِ شخصی اور حقِ عینی کے درمیان۔ حقِ عینی میں کسی شخص کو کسی مال یا چیز پر اختیار دیا جاتا ہے جبکہ حقِ شخصی میں ایک شخص کا اختیار دوسرے شخص پر ہو جاتا ہے۔ اِس طرح قرض خواہ کو قرض دار پر بڑے وسیع اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں، اِن اختیارات کے تحت قرض خواہ قرض دار کو غلام بنا سکتا ہے، اُسے فروخت کر سکتا ہے اور یہاں تک کہ اُسے موت کی سزا بھی دلوا سکتا ہے۔ کیونکہ اِس نظریے کی بنیاد شخصی آزادی ہے، اِس کی رو سے کوئی بھی فرد اِس کے لئے آزاد ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق قرض دار سے کسی بھی معاہدے پر دستخط کروالے، چاہے اِس سے قرض دار کا کتنا ہی استحصال ہوتا ہو، قرض خواہ آزاد ہے کہ وہ

جس طرح چاہے قرض دار کو پابند کر کے رکھے یا اُس پر ذمہ داری ڈالے، اِس لئے قرض دار کو جس چیز کا بھی پابند بنایا گیا ہے وہ قانوناً مجبور ہے کہ اُس کی پابندی کرے۔ اِس طرح سرمایہ داروں نے التزام (Liability) کے ذرائع کی صراحت کر دی اور مختلف مواقع پر اِن ذرائع کو منضبط کرنے کی کوشش کی۔

حقِ شخصی یا نظریۂ التزام کے تعلق سے سرمایہ داروں کی تصریح کو محض ذرا سا جانچنے پر ہی کوئی براہِ راست صرف حق کی تعریف سے اِس میں چھپے فریب کو اجاگر کر سکتا ہے، کیونکہ یہ نظریہ اُسی سے بر آمد ہوا ہے۔ کوئی بھی اِس نظریے کے فریب کا انکشاف، حقوق کے شخصی اور عینی کی تقسیم سے کر سکتا ہے کیونکہ یہ نظریہ اُسی کا ایک حصہ ہے اور اُسی کی تقسیم کے نتیجے میں قائم ہوا ہے۔ کسی بھی شخص کیلئے اگر وہ اِن غلط معاملات کو اجاگر کرنا چاہے جو کہ اِس نظریہ سے ہی نکلے ہیں، تو وہ مغربی قانون سازی کی غلطیوں کو سمجھ سکتا ہے۔ اس نظریے کی وجہ سے جو غلطیاں سمجھ میں آتی ہیں، ضرورت ہے کہ اُن کو سامنے لایا جائے۔ اِس نظریۂ التزام کی تعریف یہ ہے "یہ ایک معاہدہ ہے جس کی رو سے قرض خواہ نشاندہی کرتا ہے کہ اِس نظریہ کو ایک معاہدے کی بنیاد پر اقرار نامہ سمجھا جانا چاہئے" اِس تعریف میں وہ معاملات شامل نہیں ہیں جن میں ایسے معاہدے ہوں جن کا تعلق کسی کی امداد کرنے سے ہو، اگرچہ وہ حقِ شخصی کے تحت آجائیں گے۔ اِس تعریف میں وہ معاملات بھی شامل نہیں ہیں جن کا تعلق فردِ واحد سے ہے اور جس میں کوئی دوسرا ملوث نہیں ہے، جیسے کسی کی ذاتی خواہش یا وصیت یا مثلاً شئیر کمپنی اور کوآپریٹوز کا بنانا، میراث کا معاملہ یا کسی کو

حوصلہ افزائی کیلئے انعام دینا۔ اِس کے باوجود سرمایہ داروں نے اِن سب معاملات کو نظریۂ التزام کے زمرے میں ہی شامل کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے بہت سے معاملات ہیں جو مختلف افراد کے درمیان پیش آتے ہیں لیکن اس تعریف میں وہ نہیں آتے جیسے خیراتی اوقاف، خیرات وزکوٰۃ کا دیناوغیرہ، یہ ایسی چیز ہے جس سے تعریف کے غلط ہونے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ کیونکہ کسی بھی چیز کی تعریف سے اس کی حقیقتِ حال بیان ہوتی ہے، اسلئے یا تو تعریف یا بذاتِ خود زمینی حقیقت ہی جھوٹ ہے۔ اسلئے یہ ضروری ہے کہ اِسکی دوبارہ صحیح تعریف متعین کرنے کیلئے اُس کی حقیقت کو اچھی طرح جانچا پرکھا جائے۔ نظریۂ التزام کی متبادل تعریف یہ ہوئی ”ایک قانونی شرط جس کے مطابق...... الخ“ یعنی التزام کو ایک قانونی معاملہ سمجھنا چاہیئے اگرچہ واقعتاً یہ ایک رشتہ ہے جو دیوانی قانون کے دائرے میں آتا ہے نہ کہ صرف ایک قانونی معاملہ۔ مثال کے طور پر ریاست کی جانب سے شہریوں کیلئے ایک حکم نامہ جاری ہوتا ہے کہ وہ کسی مخصوص جنگل یا کسی بھی جنگل کی کٹائی نہ کریں، یہ ایک قانونی معاملہ ہے جس کی رو سے ایک فرد کو یا افراد کے گروہ کو ایک متعین عمل کرنے سے روکا گیا ہے۔ سرمایہ دارنہ نقطۂ نظر کے مطابق یہ معاملہ بلدیہ (Municipality) کے تحت آتا ہے جبکہ ایسا نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں اِس حکم نامہ کو التزام کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائیگا، اگرچہ واضح طور پر اِس کا کوئی تعلق التزام سے نہیں ہے۔ اِس مثال سے اس تعریف کے غلط ہونے کی تصریح ہو جاتی ہے۔

یہ نقطۂ نظر ہی غلط ہے کہ التزام (Liability) قرض دار اور قرض خواہ کے درمیان ایک قانونی بندش پر مبنی ہے، چاہے اِس کو شخصی بندھن کہیں یا اقتصادی بندھن، کیونکہ فی الواقع یہ بندھن (Bond) ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک انسانی رشتہ ہے جو اُن کے درمیان اپنی جسمانی ضروریات اور جبلت کی مانگ کو پورا کرنے کی کوشش کے نتیجے میں قائم ہوتا ہے۔ اِسلئے یہ دو افراد کے درمیان ایک رشتہ ہے جو باہمی مفاد کی وجہ سے استوار ہوا یا ایک فرد کی طرف سے رشتہ جیسے طلاق دینا، وصیت کرنا یا خیراتی وقف وغیرہ۔ زیرِ بحث معاملے میں سوال دو افراد کی موجودگی یا ایک فرد اور کسی مادی چیز کی موجودگی کا نہیں ہے بلکہ اس کو اس نظر سے دیکھنا چاہئے کہ یہ کسی شخص کے مسئلے کو حل کرنے کا معاملہ ہے جس میں اُس کی جبلتوں اور جسمانی حاجات کو منظم اور اُسکے رشتوں کو منضبط کیا جاتا ہے۔ سچائی یہ ہے جس کی نشاندہی انسانی وجود کی حقیقت سے ہوتی ہے کہ التزام کے حق کا اپنے آپ میں کوئی وجود نہیں ہے۔ دراصل یہ دو افراد کے درمیان رشتے کا معاملہ ہے جو اُن کے باہمی مفاد کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے جو قانون کے ذریعہ منظم اور حل کیا جانا چاہئے۔ ایک فرد یا ایک سے زیادہ افراد سے متعلق واقعات، سوالات، معاملات اور مسائل سے ہی رشتے استوار ہوتے ہیں، ان کے علاوہ کسی اور چیز کا اِس میں دخل نہیں ہوتا۔ قانون کے ذریعہ ہی اِس طرح کے رشتوں کا تعین کیا جاتا ہے اور کسی چیز سے نہیں۔ اقتصادی یا شخصی حیثیت سے اُس کا التزام سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ اِس معاملے کا تعلق نہ تو قرض دار اور قرض خواہ کے درمیان رشتے سے ہے اور نہ یہ کسی فرد اور کسی مادی چیز کے بندھن (Bond) سے جڑا ہے۔ بلکہ

پورے معاملے کو اس رشتے میں سمیٹا جا سکتا ہے جو دو افراد کے درمیان کسی مخصوص مفاد کی وجہ سے قائم ہوتا ہے۔ اِس مفاد کا تعلق کسی جائیداد یا اُس پر قبضے سے ہوتا ہے، یا اِس کا تعلق کسی چیز کی پیداوار سے یا کسی معاملے کی عمل درآمدگی سے ہو سکتا ہے۔ مفاد کی بنیاد پر یہ رشتہ قائم ہوتا ہے یعنی کسی چیز سے فائدہ اُٹھانے کیلئے یا کسی نقصان سے بچنے کیلئے اور یہ قانون کے ذریعہ منظم کیا جاتا ہے۔ اِس طرح تجارت یا فروختگی کا معاملہ دو لوگوں کے درمیان ایک رشتہ ہے جس کا تعلق کسی چیز کو حاصل کرنے یا اُس میں اضافہ کرنے سے ہے وہ جائیداد یا کوئی بھی چیز ہو سکتی ہے۔ ایک فرد کیلئے کسی کھوئی ہوئی جائیداد کی خواہش ہی جسے وہ حاصل کرنا چاہتا ہے، دو لوگوں کے درمیان وہ رشتہ ہے جو اُن کے درمیان عمل درآمد کی وجہ سے قائم ہوا ہے جس کا تعلق کسی چیز یا جائیداد وغیرہ سے ہے۔ شادی دو افراد کے درمیان ایک رشتہ ہے جس کا تعلق باہمی مفاد سے ہے لیکن یہاں مادی مفاد کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دو افراد کے باہمی مفاد کے علاوہ بھی کچھ تعلقات ایسے ہوتے ہیں جو کسی جائیداد یا مال و اسباب کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں مثلاً خیراتی اوقاف، زکوٰۃ و خیرات کا ادا کرنا، عبادت خانوں کی تعمیر اور عوامی خدمات جیسے چراگاہ اور پینے کے پانی کا انتظام کرنا۔ اِن تمام چیزوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مغربی قانون سازی کے مطابق جس سے مغربی قوانین اور ضابطے بنے ہیں، التزام (Liability) کا کوئی وجود ہی نہیں ہے چاہے وہ شخصی پہلو سے ہو یا اقتصادی پہلو سے۔ نتیجتاً التزام جن معنوں میں وہ چاہتے ہیں جو کہ شخصی حقوق ہیں، کا بھی کوئی وجود نہیں ہے۔ اِسلئے معاملات کوئی اختیار نہیں ہیں جو کسی مخصوص فرد کو کسی چیز پر حاصل ہو اور نہ ہی یہ دو

افراد کے درمیان بندھن (Bond) ہے۔ بلکہ یہ دو لوگوں کے درمیان کسی باہمی مفاد پر ایک رشتہ ہے جسے قانون کے ذریعہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اِس کا اطلاق اُن معاملات پر ہوتا ہے جو افراد کے درمیان واقع ہوتے ہیں جن کا تعلق پٹے پر دینے یا معاہدۂ کرایہ داری سے ہو یا کسی چیز پر عمل در آمد سے ہو یعنی کسی شخص کو اُس کے کسی عمل پر انعام دینے سے ہو۔ اِس کا اطلاق اُن معاملات پر بھی ہوتا ہے جو کسی فرد کی طرف سے کسی کاروائی کے سلسلہ میں ہو، جیسے وصیت یا میراث کا معاملہ، طلاق، خیراتی اوقاف وغیرہ۔ اِسلئے نظریۂ التزام غلط ہے، اِس طرح وہ تمام قانونی استنباط جن کی بنیاد پر یہ نظریہ قائم ہے یا جو اِس سے ماخوذ ہیں، فاسد ہیں کیونکہ یہ سب ایک غلط منبع کی جزئیات ہیں۔

کوئی شخص نظریۂ التزام کی غلطیوں اور فریب کے بارے میں اُس وقت مطمئن ہو جاتا ہے جب وہ اِس نظریے کے نتائج پر نظرِ ثانی کرلیتا ہے اور وہ لوگ جو اِسکی وکالت کر رہے ہیں اُنکو بھی اِن مسائل کا مستقل طور سے سامنا کرپڑ رہا ہے جو معاشرے میں وقت گزرنے کے ساتھ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ یہ نظریہ اور اُسکی وکالت کرنے والے دونوں معاشرے کے مسائل کا سامنا نہیں کرپائے، اِس لئے اُس کے وکیل نئے نئے مسائل کے حل کیلئے نظریے کی غلط توضیح وتشریح، غلط بیانی اور نظریے سے انحراف پر مجبور ہوئے۔ نظریۂ التزام رومیوں کے زمانے سے موجود ہے، اور مغربی قانون سازی میں یہ اُس وقت سے ہی چلا آرہا ہے۔ معاشرتی معاملات کے ارتقاء کے ساتھ ہی اِس نظریے کی غلطیاں اور اِس کا فریب اپنے آپ آشکار ہونے لگا اور نتیجتاً

زندگی کے معاملات کو چلانے میں اِسکی ناموزونیت ظاہر ہونے لگی۔ تاہم سرمایہ دار اِس نظریے کے غلط ہونے کو تسلیم کرنے کے بجائے دعویٰ یہ کرتے رہے ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ اِس نظریے میں فطری طور پر سدھار آئے گا اور یہ کسی بھی مسئلے کو حل کر دے گا، اور اِس طرح اُنہوں نے اِس نظریے کو تبدیل کیا تاکہ اُسکی عکاسی ہو سکے۔ اِس کا خاص اثر یہ ہوا کہ سرمایہ داروں نے اِس نظریے سے انحراف شروع کر دیا اور نظریے میں سدھار کے بہانے اُس کی بنیاد ہی کو تبدیل کرنے لگے۔ یہ کہہ کر کہ اِس میں بہت لچک ہے اُسے ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنے لگے یعنی اِس بہانے سے کہ اِس میں ہر طرح کی گنجائش ہے۔ درحقیقت ایسے بہت سے عوامل ہیں جن سے نظریۂ التزام کا غلط ہونا ظاہر ہوتا ہے، جو اِس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جو مختلف ادوار میں حالات کی مناسبت سے اُس میں تبدیلی کا سبب بنے۔ کمیونسٹ عقیدے کے وجود پذیر ہونے سے پہلے یورپ میں اشتراکی نظریات کا سامنے آنا اِس نظریے کی ناموزونیت کو ظاہر کرتا ہے اور اسی چیز نے قانون سازوں کو اِس نظریے سے متعلق اپنا نقطۂ نظر تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔ مزدوروں کے تحفظ کیلئے اُن سے کام کے معاہدوں میں مزدوری کی قیمت اور اُسکے اصول بنائے گئے اور اُن کو وہ حقوق دیئے گئے جن کا پہلے کوئی وجود نہیں تھا۔ جیسے مزدوروں کو یونین بنانے کا حق، اجتماعات (Conventions) اور ہڑتال کرنے کا حق۔ یہ بات نظریۂ التزام کی رومی نص (Roman Text) سے ٹکراتی ہے جس میں اِس طرح کے کسی اصول یا حق کی اجازت نہیں ہے۔ نظریے کے اقرارنامہ سے یہ بات خود آشکار ہوتی ہے کہ یہ دو افراد کے درمیان ایک معاہدہ

ہے جس سے التزام واقع ہوتا ہے لیکن اِس نظریے کی قوت اِن معاہدوں کی وجہ سے ختم ہو گئی جو مزدوروں کے گروپوں کے اتحاد اور استحکام کی وجہ سے عمل میں آئے نہ کہ کسی انفرادی مرضی کی بنیاد پر۔ اِس کے علاوہ دھوکا اور فریب کے خیال کا وجود نہیں رہا، یہاں تک کہ نظریۂ التزام بھی اِس کی اجازت نہیں دیتا۔ کوئی بھی نظریات جو کسی فرد پر مبنی ہونگے اُن کے تحت وہ فرد یا وہ افراد اِس بات کیلئے مکمل آزاد ہوں گے کہ وہ اقرار نامے کی حدود کے اندر جس طرح کا چاہیں معاہدہ کریں چاہے اِس سے دوسروں کے ساتھ کتنا ہی بڑا دھوکا ہو اور کتنا ہی نقصان پہنچے۔ جب نظریۂ التزام اور انفرادی نظریات کا فریب آشکارا ہونے لگا تو کچھ معاہدوں میں دھوکا دہی کا نظریہ شامل کیا گیا، پھر اُس میں وسعت آتی گئی یہاں تک کہ یہ عام نظریہ ہو گیا جس کا اطلاق جدید قوانین کے تمام ہی معاہدوں میں ہونے لگا۔ زندگی کے معاملات سے متعلق نئے افکار کی وجہ سے جو قدیم افکار سے ٹکراتے تھے اور کیونکہ اِن سے پرانے افکار غلط ثابت ہوتے تھے اِس سے مزید نظریۂ التزام کی غلطی اجاگر ہوئی۔ اِس کے علاوہ مزید یہ کہ مشینوں اور نئی تکنیک کا استعمال، صنعتی ترقی اور عالمی جنگوں کا پھوٹ پڑنا، اِس سے کچھ عملی مسائل سامنے آئے جن کو حل کرنے سے نظریۂ التزام قاصر رہا۔ مشینوں کے استعمال سے افراد کے سامنے اُن سے زخمی ہونے کے خطرے ظاہر ہوئے۔ پہلے نظریۂ التزام میں سوائے افراد کے کسی اور پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی۔ جب ذمہ داری فرد سے مشین کی طرف منتقل ہوئی تو اِس سے مزید اِس نظریے کا غلط ہونا ثابت ہوا۔ اِس طرح ایک فرد دوسرے فرد کو نقصان پہنچنے کی شکل میں کسی قسم کا معاوضہ دینے کا پابند

نہیں ہو گا، جب تک کہ یہ عمل اُس نے جان بوجھ کر نہیں کیا ہو۔ ہاں جان بوجھ کر نقصان پہنچانے کی شکل میں اُس پر معاوضہ دینے کی ذمہ داری عائد ہو گی۔ دوسرے الفاظ میں جس سے غلطی سرزد ہوئی ہے نقصان کی تلافی کا ذمہ دار ہو گا اور اُسی کو معاوضہ دینا پڑے گا۔ کام کے دوران کسی بھی وجہ سے اگر مزدور زخمی ہو جاتا ہے تو یہ مالک کی ذمہ داری ہو گی کہ وہ مزدور کو معاوضہ دے، اِس چیز کو نظریۂ التزام میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ مغربی قانون سازی میں بیمہ کا معاہدہ ایک فرد تک محدود نہیں رہتا بلکہ دوسرے فریق کا بھی اِس میں دخل ہوتا ہے۔ یہ بات نظریۂ التزام سے متضاد ہے کیونکہ یہ دو افراد کے درمیان ایک بندھن ہے۔ اِسی لئے دوسرے کے مفاد کو پیشِ نظر رکھنے کا نظریہ سامنے آیا۔ مثال کے طور پر ایک شخص نے اپنے بچوں کے فائدے کیلئے بیمہ کرایا جبکہ بیمہ کراتے وقت اُسکے بچے تھے بھی یا نہیں یہ واضح نہیں ہے۔ یہ بات نظریۂ التزام سے ٹکراتی ہے کیونکہ یہ دو افراد کے درمیان کا بندھن ہے لیکن اگر بیمہ ہوتے وقت بچے موجود نہیں تھے، تو وہ بچے اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ اِسکے علاوہ دوسرے مسائل جیسے تجارتی اشیاء اور، مزدوری کی قیمتیں جبری طور پر مقرر کرنا اور عوامی ذمہ داریوں سے متعلق معاہدے، یہ سب نظریۂ التزام سے متضاد ہیں پھر بھی اِن کو جدید مغربی قانون سازی میں شامل کیا گیا ہے۔ اور بھی مسائل ہیں جیسے دھوکہ دہی جس سے معاہدہ فسق ہو جاتا ہے، وہ اصول جو کسی ایسے معاہدے کی اجازت نہیں دیتے جو عوامی حکم نامہ سے مناسبت نہ رکھتے ہوں اور جو دوسروں کو غیر قانونی طریقہ سے نقصان پہنچانے سے روکتے ہوں۔ مثال کے طور پر ایک کسان اپنے مویشی کو پڑوسی کی فصل چرنے کیلئے

لاپرواہی سے چھوڑ دیتا ہے، اور نامناسب فائدہ اُٹھانا جو ایک شخص کو دوسرے شخص کی قیمت پر فائدہ اُٹھانے سے روکتا ہے جیسے دوسرے کی زمین پر مکان بنالینا یا ایسے کام کیلئے قرضہ جس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ اِن سب کی نظریۂ التزام سے کوئی مناسبت نہیں ہے جس سے اس کے غلط ہونے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ مسائل اور معاملات رکاوٹ بنتے ہیں اور حقِ شخصی سے ٹکراتے ہیں اور اُسے ختم کرتے ہیں اِس معنی میں کہ یہ جائز اور مطلق حق ہے۔ تاہم جیسا کہ پہلے ہی ذکر ہو چکا سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے التزام، قرض خواہ اور قرضدار کے درمیان قانونی بندھن کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے جو اپنے حق کو حاصل کرنے یا منتقل کرنے کا اختیار دیتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اِس میں اقراری فردِ حساب(Bill of Promissory)کے تسلیم کئے جانے کی صراحت موجود نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ ایسا اقرار ہے جس میں اِس سے متعلقہ فرد کے ذریعہ اِس کا تسلیم کیا جانا شامل نہیں ہے۔ اِس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ اِس میں یہ صراحت نہیں ہے کہ قرض خواہ نے قرض کی منتقلی قبول کرلی ہے کیونکہ اِس میں قانونی الجھن یہ ہے کہ جو شخص مال و جائیداد کو منتقل کرانے کا پابند ہے، اُس کی طرف سے صاف و شفاف معاملہ اور انصاف کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ سادہ سی بات ہے کہ جس شخص کے اوپر ذمہ داری منتقل ہو رہی ہے اس کو محض مطلع کرنا کافی نہیں ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اِس منتقلی کو قبول کرے کیونکہ منتقلی کا فردِ حساب(Bill)اُسی وقت صحیح ہوگا جبکہ معاہدے پر دستخط کرنے والے اِسے قبول کریں۔

یہ خلاصہ ہے اُن پیش آمدہ مسائل کا جن کا نظریۂ التزام کو سامنا ہے، اِس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نظریہ کسی فکر کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ لوگوں کے درمیان ایسے کئی مختلف رشتے ہیں جن کا استنباط اِس نظریے کی بنیاد پر ممکن نہیں ہے مثلاً یہ حقیقت کہ کوئی بھی دھوکہ دہی معاہدے کو ختم کر دیتی ہے۔ اِس کو عام کرنے کی بھی گنجائش نہیں ہے کیونکہ مفروضہ غلطیوں کی ذمہ داری جیسے کام کے دوران مشین کے استعمال سے زخمی ہو جانا، اقراری مسودۂ قانون (Bill of Exchange) یا دوسرے فریقوں کے مفاد جیسے اُن بچوں کے فائدے کیلئے بیمہ کرانا جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے ہیں، انفرادی وصیت، جیسے خیراتی اوقاف، یہاں تک کہ سرمایہ داروں کی شئیر کمپنیاں اور اِسی طرح کے معاہدے اور معاملات، اِس میں سے کوئی بھی نظریۂ التزام میں شامل نہیں ہیں نہ تو اِس نظریے کی تعریف کے الفاظ میں اور نہ ہی اُس کے معنی کے لحاظ سے۔ یہ نظریہ بہت سے عام اصولوں سے بھی مناسبت نہیں رکھتا جیسے معاہدوں میں دھوکہ دہی یا اُن جگہوں پر خرچ نہ کرنا جہاں وہ اخلاقیات یا عام نظام سے متعلق ہوں۔ اِس میں اتنی استطاعت نہیں ہے کہ وہ مختلف لوگوں اور تہذیبوں کو ایک ہی قانون کے تحت جوڑ سکے، جیسا کے اِس کی خامی سے ظاہر ہو گیا جب اشتراکیت کے نظریات سامنے آئے اور صنعتی انقلاب واقع ہوا۔ یہ اپنی بنیاد ہی سے غلط ہے کیونکہ یہ شخصی آزادی اور ملکیت کی آزادی کے دوہرے تصورات پر مبنی ہے اور یہ دونوں آزادیاں لوگوں میں بگاڑ یا فساد (Corruption) پیدا کرتی ہیں، استحصال، سامراجیت اور استعمار

کو جنم دیتی ہیں، کیونکہ جو قانون اِن دونوں آزادیوں کو تحفظ فراہم کرتا ہے اُس کی بنیاد یہ نظریۂ التزام ہی ہے اِس سے کرپشن اور پریشانی میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔

یہ حقیقت ہے مغربی قانون سازی کی جس نے اسلامی شریعت کو چیلنج کیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ حقیقت ہے نظامِ سرمایہ داری کی جس کے چیلنج کا اسلامی نظام کو سامنا ہے۔ جہاں تک اسلامی شریعت کا تعلق ہے جس پر مغربی قانون سازی حملہ آور ہوئی اور اُسے سخت تنقید کا نشانہ بنایا، یہ کوئی مفروضہ نظریات پر مبنی نہیں ہے جس سے ضوابط و حل وضع کئے گئے ہوں جیسا کہ مغربی قانون سازی کے معاملے میں ہے بلکہ یہ قطعی عقیدہ سے مستنبط ہیں جس میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اِس کا آغاز نظریۂ حق سے نہیں ہوا نہ یہ حقِ شخصی اور حقِ عینی سے نکلی ہے بلکہ اِس کا آغاز ایک قطعی اور فیصلہ کن عقیدہ سے ہوا ہے اور اُس کے ماننے والوں کا اِس پر حتمی یقین ہے۔ اِس طرح جو کچھ بھی اِس عقیدے سے مستنبط ہے وہ اسلامی شریعت ہے اور جو بھی اِسکے علاوہ ہے وہ اسلامی شریعت سے ہٹ کر ہے۔ اب اِس میں سے کونسی قانون سازی صحیح ہے؟ وہ شریعت جو عقل کو قبول ہونے والے عقیدہ سے نکلی ہو اور جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو یا وہ قانون سازی جو مفروضہ نظریات سے نکلی ہوئی ہو، خاص طور سے جب اِن نظریات کی غلطیاں نمایاں ہونا شروع ہو گئیں ہوں جب اِن کے سامنے نئے مسائل آئے، اِسکے علاوہ اِن کی یہ حقیقت اپنی جگہ کہ اِس کی تعریف سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ یہ حقیقت اور سچائی سے کتنی دور ہے۔

شریعتِ اسلامیہ کا ماخذ اسلامی عقیدہ ہے یعنی اللہ وحدہٗ لا شریک پر ایمان، اُسی کے ساتھ اُس کی کتابوں، رسولوں، فرشتوں اور یومِ قیامت پر ایمان۔ دوسرے الفاظ میں یہ قرآن اور سنت سے مستنبط ہے جو کہ عقلی طور پر فیصلہ کن طریقہ سے ثابت ہے کہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ جو کچھ نازل ہوا اُسی کے تحت دلائل، اصول اور ضابطوں کو ترتیب دے کر شریعتِ اسلامی کا دستور مرتب کیا گیا ہے۔ اِسی لئے جب اسلامی شریعت یا خالص اسلام کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اِس مطالعہ کی بنیاد یہی ہوتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے نہ کہ کسی انسانی دماغ کی پیداوار، اسلام کا مطالعہ کرنے، اِس پر غور و فکر کرنے اور اس کے متعلق نقطۂ نظر کی یہی بنیاد ہے۔ اسی وجہ سے قطعی عقلی ثبوت سے یہ ثابت ہونا ضروری ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے اور اِسی نازل شدہ ماخذ سے اسلامی قانون ترتیب دیا گیا ہے، یعنی اِس فیصلہ کن عقلی ثبوت سے ہی یہ سمجھ میں آئے گا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بنی نوع انسان کیلئے ایک مکمل نظام بھیجا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ نظامِ اسلام قرآن پاک اور احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ جہاں تک قرآن کا سوال ہے قطعی دلائل سے یہ ثابت ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ کہ قرآن عربی کتاب ہے جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے اور اُنہوں نے ہی فرمایا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اب ہم عقلی طور پر کیسے مطمئن ہوں کہ قرآن اللہ کا کلام ہے؟ اس بات کیلئے تو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں کہ یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے آئی ہے۔ اب اِس دعوے کو

عقل کی کسوٹی پر جانچیں تو اس کی تین ہی ممکنہ شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ یہ کسی عربی داں شخص نے لکھی ہے اور اُس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حاصل کرلی، دوسرے یہ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے اور دعویٰ یہ کیا جارہا ہے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے، تیسرے یہ کہ واقعی یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اِن تین شکلوں کے علاوہ اور کوئی شکل ممکن نہیں کیونکہ قران اپنی زبان اور اندازِ بیان دونوں لحاظ سے عربی میں ہے۔ اب ایک ایک ممکنہ شکل کا عقلی تجزیہ کریں۔ اگر یہ کسی عرب کا کلام ہے تو یہ بالکل غلط ہے کیونکہ قرآن خود تمام عربوں کو چیلنج کرتا ہے کہ وہ اِس طرح کا کلام پیش کرکے دکھائیں:

﴿ قُلْ فَأْتُوا۟ بِعَشْرِ سُوَرٍۢ مِّثْلِهِۦ ﴾

”کہہ دو کہ تم اِس جیسی دس سورتیں بنالاؤ“۔ (سورۂ ھود؛11:13)

﴿ قُلْ فَأْتُوا۟ بِسُورَةٍۢ مِّثْلِهِۦ ﴾

”کہہ دو کہ تم اِس کی طرح ایک ہی سورۃ بنالاؤ“۔ (سورۂ یونس؛10:38)

عربوں نے اِس بات کی سرتوڑ کوشش کی کہ وہ اِس طرح کا کلام تیار کریں لیکن وہ اُس کوشش میں ہمیشہ ناکام رہے۔ قرآن کے اِس چیلنج کے جواب میں باوجود اپنی کوشش کے اُن کی ناکامی سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ کسی عرب کی لکھی ہوئی کتاب نہیں ہے۔ اب جہاں تک اسکے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ لکھے جانے کا امکان ہے تو یہ بھی بالکل غلط ہے، کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود

بھی عرب تھے اور اس چیلنج میں وہ بھی شامل ہیں، کیونکہ وہ ایک انسان ہی تھے اور اُسی قوم اور معاشرے کے ایک فرد۔ جب عرب قرآن کی طرح کا کلام پیش نہیں کر پائے تو یہ بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی صادق آتی ہے اور وہ بھی اِس قرآن کے مثل کلام پیش نہیں کر سکتے۔ اِس سے یہ ثابت ہوا کہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے۔ مزید یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح احادیث کا ایک بڑا ذخیرہ ہمارے لئے چھوڑا ہے، اور یہ احادیث تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں اور جو سند کے اعتبار سے ہر شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ اگر اِن احادیث کا موازنہ آیاتِ قرآنی سے کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اِن دونوں میں زبان کے لحاظ سے کوئی یکسانیت نہیں ہے۔ ایک ہی وقت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ آیات بھی بیان فرماتے اور احادیث بھی، دونوں کے اندازِ بیان میں نمایاں فرق محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایک آدمی کا کلام چاہے وہ اُس کو کتنا ہی بدل کر بیان کرنے کی کوشش کرے، اُس کے انداز میں یکسانیت رہے گی، کیونکہ اندازِ بیاں آدمی کی شخصیت کا ہی ایک حصہ ہوتا ہے۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ حدیث اور آیات کے انداز میں کوئی یکسانیت نہیں ہے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے، اِس وجہ سے کہ دونوں کی زبانوں اور انداز میں نمایاں فرق ہے۔ کیونکہ آدمی اپنے آپ کو اِس دور اور ماحول سے علیحدہ نہیں کر سکتا جس دور میں وہ رہتا ہے، اپنے زمانے کی زبان کے علاوہ دوسرے زمانے کی زبان وہ استعمال ہی نہیں کر سکتا چاہے وہ کتنی ہی کوشش کرے۔ اِسلئے وہ اپنی حقیقت سے بچ نہیں سکتا یعنی وہ کسی بھی طرح معنی اور انداز کے

لحاظ سے اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبان استعمال نہیں کر سکتا۔ ادب کے نقادوں نے دورِ جاہلیت کی شاعری کا ریکارڈ تیار کیا ہے اور یہ کہا گیا کہ قرآن کی زبان اِس دور کی نہیں ہے۔ اِن نقادوں نے اِسے عباسی، اموی، اور اندلسی زبانوں سے بھی مختلف پایا۔ اس سے اور یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ آدمی اپنے دور اور اپنی خود کی زبان سے ہٹ کر کوئی کلام کہہ نہیں سکتا۔ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اندازِ بیان میں صرحی فرق ہونے کی وجہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے۔ اب کیونکہ یہ ثابت ہو گیا کہ قرآن نہ تو کسی عرب کا کلام ہے اور نہ ہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تو یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ معجزہ ہے جو اسے پیش کر رہا ہے۔

جہاں تک اِس حقیقت کا تعلق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے، اس سے نشاندہی ہوتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ قرآن کی طرح حدیث بھی اللہ کا پیغام ہے جو اُس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کیا۔ یہ بات ثابت ہوئی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں کیونکہ یہ وہی ہیں جنہوں نے قرآن پیش کیا جو کہ اللہ کا کلام اور اُس کی شریعت ہے۔ کیونکہ اللہ کی شریعت سوائے نبیوں کے اور کوئی نہیں لاتا اسلئے یقینی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبی اور رسول ہیں۔ اِسی لئے آپ کی حدیث اللہ کی وحی ہے، کیونکہ یہ رسول کی حدیث ہے اور رسول کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ قرآن جس کے

بارے میں قطعی طور پر ثابت ہو چکا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے خود اِس بات کو بیان کر رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اللہ کی طرف سے وحی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ ﴾

”میں تو بس اُس کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے“۔(سورہ الانعام:6:50)

﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلْهَوَىٰٓ (٣) إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (٤)﴾

”اور نہ وہ اپنی خواہش سے بولتا ہے وہ تو بس ایک وحی ہے جو کی جارہی ہے“۔(النجم:4،53:3)

﴿قُلْ إِنَّمَآ أُنذِرُكُم بِٱلْوَحْيِ ﴾

”کہہ دو" میں تو بس وحی کی بناء پر تمہیں خبر دار کرتا ہوں“۔(سورہ الانبیاء:21:45)

اِس عقلی اور فیصلہ کن دلیل سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی کہ قرآن اور سنت اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہیں۔ کیونکہ انہی دونوں سے اسلامی شریعت بنی ہے لہٰذا عقلی اور قطعی طور پر یہ بات ثابت ہوئی کہ شریعتِ اسلامی بھی اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ اِس طرح جو بات بھی قران اور سنت میں کہی گئی ہے وہ بھی اللہ کی طرف سے وحی کی ہوئی ہے۔ نتیجتاً جو بات بھی قران اور سنت سے مستنبط ہے وہ اللہ کی بات ہے۔ اِسلئے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ شریعتِ اسلامی مفروضہ نظریات کا مجموعہ نہیں ہے جسے جدید واقعات پر منطبق کیا جا رہا ہو بلکہ یہ شریعت عام معنی کے لحاظ سے من جانب اللہ، رسول کے ذریعہ بھیجی گئی ہے۔ دنیا میں پیش آنے والے ہر مسئلے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور اسی سے جدید مسائل کو حل کرنے کیلئے اصول وضع کئے جاتے

ہیں۔ اِن سے استنباط کئے ہوئے اصول بھی نازل شدہ چیز کا ہی حصہ ہیں۔ اِسی لئے علماء نے شرعی اصول (حکم) کی تعریف یہ بتائی ہے کہ "یہ بندوں کے اعمال کے تعلق سے شارع کا خطاب ہے"۔ اس طرح یہ مستنبط احکام اللہ تعالیٰ کے خطاب ہی کا حصہ ہیں تاکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو لوگوں تک پہنچا دیں، کیونکہ یہ احکام اللہ کے کلام سے ہی مستنبط ہیں خواہ براہِ راست الفاظ کی شکل میں یا معنی کے لحاظ سے۔

مذکورہ بالا امور کی بنیاد پر ہی شریعتِ اسلامی کا مطالعہ ہونا چاہئے یعنی اِس بنیاد پر کہ یہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہیں۔ اِسی نقطۂ نظر سے اور اِس دائرے ہی میں رہ کر اِسے سمجھنا چاہئے کہ یہ وہ شریعت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے۔ ایک بار یہ ثابت ہونے کے بعد کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے، تو اِسی حیثیت سے اِس کا مطالعہ ہونا چاہئے یعنی جو بھی اس کا مطالعہ کرے وہ یہ سمجھ کر کرے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی شریعت ہے۔ جب اس سے کوئی اصول مستنبط کیا جائے تو اس کو بھی یہی سمجھنا چاہئے کہ یہ اللہ کی شریعت سے لیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی مسئلے کے حل کیلئے اس کا مطالعہ کرتا ہے تو اُس کو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ حل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اس حل کو جانچنے کی بنیاد یہ شریعت ہو گی نہ کہ حل نکالنے والے کی مرضی اور مزاج، اور نہ زمانے کے موجودہ چلن سے اُس کی مناسبت زیرِ غور لائی جائیگی، کیونکہ حل نکالنے کے مقصد میں سچائی ہونا چاہئے اور حق اور سچائی تو صرف وہی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف سے ہو۔

اسلامی شریعت کے حق ہونے اور ہر دور اور ہر نسل کے لوگوں کیلئے مناسبِ حال ہونے کی وضاحت کرتے وقت اِس بنیادی سوال کا جواب حاصل کرنا ضروری ہے کہ لوگوں کیلئے یہ شریعت کیا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے؟ ایک بار اگر یہ ثابت ہو جائے تو پھر یہ بات یقینی ہو جائیگی کہ یہ سچی شریعت ہے۔ ایسا اسلئے بھی ہے کہ اس کے خدائی شریعت ہونے کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی چیز کیلئے ضروری ہے کہ وہ کسی بھی طرح کی کمی سے پاک ہو اور اپنے آپ میں مکمل ہو۔ یہ ثابت ہو چکا کہ اللہ کا قانون جس شکل میں یہ آیا ہے وہی صحیح اور موزوں ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ یہ ہر زمانے، ہر نسل اور تمام لوگوں کیلئے آیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَآ أَرْسَلْنَـٰكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ﴾

”ہم نے تو تمہیں سارے ہی انسانوں کیلئے (نبی بنا کر) بھیجا ہے“۔ (سورہ سبا: 34:28)

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنِّى رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ﴾

”اے لوگو، میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں“۔ (سورہ الاعراف: 7:158)

یہ ناگزیر ہے کہ اِس شریعت کو ہی تمام افکار کا ماخذ ہونا چاہیئے جس سے تمام انسانی تعلقات اور رشتوں کا تعین ہوتا ہے۔ اِس کیلئے یہ بھی ناگزیر ہے کہ اس میں اتنی وسعت ہو کہ اِس میں تمام ہی قسم کے معاملات اور جدید مسائل کا حل ہو۔ ایسی حالت میں عام افکار اور ہمہ گیر افکار کے قیام کیلئے یہ ایک زرخیز زمین ہوگی۔ جب تک یہ تمام انسانوں کیلئے بحیثیت انسان کے ہوگی، یہ تمام لوگوں

کے مسائل کو حل کرے گی چاہے وہ کسی بھی قوم کے اور کسی بھی ماحول میں رہنے والے ہوں۔ یہ سب اس حقیقت کی وجہ سے ہے کہ یہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی بھیجی ہوئی شریعت ہے جو کہ اُس نے اپنے رسول پر نازل کی تا کہ وہ اِس کو عمل کرنے کیلئے لوگوں تک پہنچا دیں۔ شریعتِ اسلامی کے تعلق سے یہ ہے اصل معاملہ جو بندوں کے عمل کرنے کیلئے شارع کا خطاب ہے یعنی یہ تمام مسائل کیلئے اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ حل ہے۔ جب اس نے سود خوری کو حرام قرار دیا تو اس میں یہ سوچنا ہمارا کام نہیں ہے کہ زمانہ کیسا ہے اور جدید تہذیب اسے قبول کرے گی یا نہیں۔ صرف ایک ہی چیز اس میں دیکھنا ہے کہ آیا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ شریعت سے مستنبط ہے یا نہیں۔ اگر یہ نازل شدہ ہے تو یہ صحیح حکم ہے ورنہ نہیں۔ یہ کہنا غلط ہے کہ یہ تجارتی تعلقات پر پابندی لگاتی ہے اور بیرونی دنیا سے یہ اقتصادی رشتہ منقطع کر لیتی ہے جس سے ملک تنہا پڑ جاتا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ جس بنیاد پر زندگی کا نقطۂ نظر قائم ہے وہ یہ ہے کہ اعمال کی کسوٹی شریعت کو ہونا چاہئے۔ صرف شریعت کو ہی فیصلہ کرنا چاہئے یعنی حلال اور حرام کی بنیاد پر ہی فیصلہ ہونا چاہئے۔ اسلئے جو چیز بھی شریعت سے ہٹ کر ہے وہ قابلِ رد ہے۔ اسی طرح جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے شوہر پر بیوی کا نفقہ فرض قرار دیا تو چاہے بیوی دولت مند ہی کیوں نہ ہو، اِس میں یہ کہنا غلط ہو گا کہ یہ قاعدہ جدید زمانے سے مناسبت رکھتا ہے یا نہیں۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ زندگی کی گاڑی بیوی کے تعاون سے چلتی ہے اسلئے گھر کے اخراجات میں بھی بیوی کو تعاون کرنا چاہئے۔ نہ یہ کہنا صحیح ہے نان و نفقہ کی ذمہ داری صرف غریب بیوی کیلئے ہے امیر کیلئے نہیں۔ اس طرح کے

سوالات اور بیان نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ یہاں سوال صرف یہ غور طلب ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی وحی سے مستنبط ہے یا نہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ صحیح ہے ورنہ نہیں۔ اِسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جائز چیزوں پر جتنی چاہیں اور جس طریقہ سے چاہیں دولت خرچ کرنے کی اجازت دی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شوہر اگر چاہے تو اپنی بیوی کو پانچ لاکھ دینار کی قیمت کے زیور اور جواہرات دلوا سکتا ہے، اور وہ اپنے بچوں کے کھیل کیلئے دس لاکھ دینار بھی خرچ کر کے مختلف کھیل کے میدان بنوا سکتا ہے۔ کوئی شخص اپنے دس لڑکوں میں ہر ایک کو سات سات کاریں دلوا سکتا ہے تا کہ وہ ہر دن نئی کار استعمال کر سکیں۔ کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ان تمام چیزوں کی اجازت دی ہے، اسلئے یہ نہیں کہنا چاہئے کہ یہ بات مالی مفاد سے ٹکراتی ہے یا یہ بات اُس شخص کے مفاد کے خلاف ہے یا ذہن اس بات کو قبول نہیں کرتا۔ یہ کہنا بالکل صحیح نہیں ہے بلکہ اس میں معلوم کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ اجازت اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی سے مستنبط ہے یا نہیں، اگر ایسا ہے تو یہ اصول صحیح ہے، اسی طرح تمام دوسری چیزیں۔ یہاں بنیادی بات یہ ہے کہ کسی بھی اصول کو جانچنے کیلئے کہ یہ صحیح ہے یا غلط، یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی سے مستنبط ہے یا نہیں۔ اگر یہ وحی سے لیا گیا ہے تو یہ جائز ہے ورنہ نہیں۔ اس کے علاوہ دوسری کوئی بھی چیز قابلِ غور نہیں ہے۔

یہ اسلام کیلئے بنیادی شرط ہے۔ جہاں تک خود اسلام کی حقیقت کا سوال ہے، اسلام اصل میں کچھ افکار کا مجموعہ ہے۔ فکر سے کسی واقعہ کی جانچ کی جاتی ہے۔ اِس طرح اسلام کسی واقعہ کو جانچنے سے

عبارت ہے۔ اسلئے ہر چیز کو سمجھنے کیلئے وحی (شریعت) کو سمجھنا ضروری ہے کہ وہ اِس سلسلے میں کیا ہدایت دیتی ہے۔ جو کچھ اسلام پیش کر رہا ہے اِسے سمجھنا اور محسوس کرنا چاہئے یا اُس کی بنیاد کو سمجھیں جو کچھ وحی کے ذریعہ آیا ہے۔ اسلئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ وحی کی نص (Text) کیا ہے، آیا اس کے الفاظ و معانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں یا اس کے معانی اللہ کی طرف سے ہیں اور الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری اور کوئی چیز وحی نہیں ہے۔ وحی میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی جو آدمی سمجھ نہ سکے، یا تو وہ بات وحی سے ہی ہوگی یا وحی سے مستنبط۔ ایسی کسی نص کا کوئی وجود نہیں ہے جو انسانی ذہن کی گرفت سے بالاتر ہو۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام ایک فکر ہے، اس کی بنیاد عقل ہے اور عقل ہی اس کو سمجھنے کا آلہ ہے۔ نتیجتاً عقل ہی اصل میں وہ بنیاد ہے جس پر اسلام قائم ہے۔ یہ وہ بنیاد ہے جس سے ہم اسلام کی نص کو سمجھتے ہیں۔ اِسی لئے اسلام پر یقین (ایمان) عقل کی بنیاد پر ہوتا ہے، اور جو کچھ اسلام لایا ہے اُسے عقل سے ہی سمجھا جاتا ہے یعنی اسے عقل پر موقوف رکھا گیا ہے۔ مطالعہ کرتے وقت اسلام کو بھی موجودہ افکار کی طرح دیکھنا چاہئے، اس کی حقیقت کو عقل کی کسوٹی پر جانچنا چاہئے اور کسی بھی فکر کی طرح اسلام کو بھی سمجھنے کی بنیاد عقل ہونا چاہئے۔ بیک وقت اُس کی نص جس میں اُس کے افکار ہیں عقل میں سمانا چاہئے اور اِس کا مفہوم سمجھ میں آنا چاہئے۔ اسلام کی نص میں ایسے کوئی پر اسرار الفاظ نہیں ہیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہو، نہ تو ایسا قرآن مجید میں ہے اور نہ احادیثِ پاک میں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾

"اور یہ ذکر تمہاری طرف ہم نے نازل کیا تا کہ تم لوگوں کیلئے جو کچھ اُن کی طرف نازل ہوا، کھول کھول کر بیان کر دو اور تا کہ وہ غور و فکر سے کام لیں"۔ (سورہ النحل؛16:44)

اس طرح جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کو عقل سے سمجھنا چاہئے تو یہ بات بالکل صحیح ہے، اِسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ اسلام کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہئے کیونکہ عقل ہی اسلام کی بنیاد ہے۔ اسلام کو سمجھنے اور اُس پر عمل کرنے کا انحصار اِس پر رہتا ہے کہ آپ نے اُس کے آلہ یعنی عقل کو استعمال کیا کہ نہیں۔

تاہم دماغ کی ایک حقیقت ہے، اسلئے اس کا استعمال اُس کی حقیقت کے مطابق ہونا چاہئے، اسی کو عقلی طریقہ کہا جاتا ہے۔ دماغ کی حقیقت کا ایک جُزو یہ ہے کہ حقیقت کو قابلِ فہم ہونا چاہئے تا کہ وہاں عقل کام کر سکے۔ اگر حقیقت قابلِ فہم نہیں ہے تو وہاں عقلی طریقہ بھی نہیں ہو گا یعنی دماغ کا کوئی استعمال نہیں ہو گا۔ اسلئے جب تک قابلِ فہم حقیقت نہ ہو گی وہاں ادراک بھی نہ ہو گا اور قابلِ فہم حقیقت کے بغیر کوئی فکر بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اگر قابلِ فہم حقیقت نہیں ہے تو وہ چیز صرف خیالی ہو گی اور فریب پر مشتمل ہو گی جس کا عقل، فکر اور ادراک سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ اِسلئے حقیقت کو سمجھنے کیلئے دماغ وہاں کام نہیں کرتا جہاں چیز ہی ناقابلِ فہم ہو کیونکہ دماغ کیلئے اس کا ادراک ناممکن ہے یعنی ایسی جگہ عقلی طریقے سے کام لینا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ ایسے معاملے

میں دماغ میں اگر اِس کا وجود قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے، تو ایسی حقیقت کے وجود کو قبول کرنا پڑے گا نہ کہ اُس کی ماہئیت کو، یا دماغ اس کو بالکل رد کر دیتا ہے اگر اس کا وجود قطعی طور پر ثابت نہ ہو۔ اِس طرح عقل سے اللہ تعالیٰ کی ذات کا ادراک نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اُس کی ذات عقل و فہم سے بالاتر ہے اسلئے اُس کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ بلکہ اس کی ذات کو اُس کی تخلیق کی حقیقت سے سمجھا جا سکتا ہے یعنی ان کا یقیناً کوئی خالق ہے۔ اِس طریقے سے ایک شخص اللہ کے وجود کا ادراک کر سکتا ہے، کیونکہ یہ بات قابلِ فہم ہے، اللہ کا وجود ایک حقیقت ہے، کیونکہ مخلوق کا وجود اِس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ اِن کا کوئی خالق ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قابلِ ادراک اور قابلِ فہم چیزوں کا وجود ایک قطعی معاملہ ہے کیونکہ اپنے حواس اس کے شاہد ہیں۔ واقعتاً قابلِ ادراک چیزیں اپنے وجود کیلئے اپنے علاوہ کچھ اور چیزوں کی محتاج رہتی ہیں یعنی اُنہیں وجود میں آنے کیلئے کچھ دوسری چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ اگر ہم انہیں دیکھیں تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ دوسری چیزوں کے بغیر نہ تو وہ کوئی عمل کر سکتی ہیں اور نہ ہی وہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ اِس طرح آگ صرف آتش پذیر مادے ہی میں لگتی ہے، اگر ایک چیز اپنی صفت کے اعتبار سے آتش پذیر (Combustible) نہیں ہے تو آگ اُسے نہیں جلائے گی۔ مخصوص تیزابوں میں کچھ عناصر (Elements) گھل جاتے ہیں جبکہ کچھ دوسرے عناصر اُن تیزابوں میں نہیں گھلتے۔ کچھ عناصر کے باہمی تعامل (Reaction) سے ایک مرکب (Compound) بن جاتا ہے، جبکہ دوسرے عناصر سے وہ مرکب نہیں بنتا۔ دو ہائیڈروجن کے

ذرات (Atoms) اور ایک آکسیجن ایٹم کے باہمی تعامل سے پانی بن جاتا ہے، لیکن وہی دو ہائیڈوجن کے ذرات اگر ایک کے بجائے دو آکسیجن کے ذرات سے ملیں تو آبِ ثقیل (Heavy Water) بنتا ہے، جو ایک ایسی چیز ہے جو عام پانی کی طرح زندگی نہیں بچا سکتا۔ اِن چیزوں کا ہر ایک عنصر سے تعامل ممکن نہیں ہے کچھ مخصوص معاملات کو چھوڑ کر اُن کو ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلا نہیں جا سکتا۔ مندرجہ بالا محدود معاملات کو چھوڑ کر اُن کا تعامل ممکن نہیں ہے جب تک اُن میں کوئی تبدیلی نہ لائی جائے یا پھر دوسرے عوامل شامل نہ کئے جائیں۔ اس لئے یہ کسی چیز پر منحصر رہتے ہیں یا یہ کچھ عوامل اور حالات کے محتاج ہیں۔ اس لئے آگ میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ کسی بھی چیز کو جلا سکے جب تک کہ وہ چیز خود آتش پذیر نہ ہو۔ اس لئے آگ کسی چیز کو جلانے کیلئے آتش پذیری کی محتاج ہے۔ تیزاب کچھ مخصوص تحلیل پذیر عناصر کو ہی تحلیل کر سکتا ہے۔ اس طرح محلول (Solution) بنانے کیلئے کچھ تحلیل پذیر عناصر کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ عناصر باہم مل نہیں سکتے یا اُن کے درمیان کیمیائی تعامل (Chemical Reactions) ممکن نہیں جب تک اُن کے اندر ملنے اور تعامل کی صلاحیت نہ ہو۔ یہ اُن عناصر کے محتاج رہتے ہیں جن کے اندر یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ اُن میں تعامل ہو اور وہ باہم مل کر ایک کیمیائی مرکب بنائیں۔ سادے پانی کو آبِ ثقیل میں تبدیل کرنے کیلئے اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ آکسیجن میں ایک ایٹم اور جوڑا جائے اور اس کو دو ہائیڈروجن ایٹمز کے ساتھ ملا کر آبِ ثقیل بنتا ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ جو چیز پہلے سے اس کے اندر موجود ہے اس کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ اُسی

چیز کی ایک مقدار ملانے کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ بھی کہ کوئی اس کو ملانے والا ہو، اس طرح یہ کسی کی محتاج ہوئی۔ یہ کہنا غلط ہے کہ کائنات میں جو چیزیں ہیں، اُنہیں ایک دوسرے کی ضرورت رہتی ہے، مگر مجموعی طور پر اُن کا کسی دوسری چیز پر انحصار نہیں ہے۔ یہ سچ نہیں ہے کیونکہ ضرورت کا ذکر اور تشریح کسی ایک مخصوص چیز کے تعلق سے کی جاتی ہے۔ اس ضرورت کو محسوس کیا جانا چاہئے نہ کہ ایسی چیز کیلئے خیالی طور پر فرض کرلیا جائے جس کا کوئی وجود ہی نہ ہو، نہ کہ اس کا وجود محض فرض لیا جائے۔ اسلئے یہ کہنا غلط ہے کہ آگ کو کسی آتش پذیر چیز کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ اگر وہ ملیں تو تب اِن کو کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑیگی، کیونکہ یہ ایک خیالی مفروضہ ہے۔ آگ میں اور آتش پذیر مادے میں جس چیز کی احتیاج ہوتی ہے یہ اُس چیز کی ضرورت ہے جو وجود رکھتی ہے اور اس کو حواس کی کسی بھی حس سے محسوس کیا جاتا ہے یا دماغ کے ذریعہ اس کا ادراک کیا جاتا ہے۔ کسی چیز کو دماغ سے سمجھنے کیلئے ایک احساس کی ضرورت ہوتی ہے جو اُس کی ذات پر پڑے تاکہ اُس چیز کے تعلق سے جو موجود ہے اس ضرورت کی تشریح ہو سکے۔ آگ، کوئی چیز جو موجود ہو اور کوئی آتش پذیر شئے کے تعامل سے کوئی ایسی چیز پیدا نہیں ہوتی جس کی ایسے تعامل کو ضرورت ہو یا وہ ضرورت سے مستغنی ہو۔ اسی طرح کائنات کی چیزیں ملانے سے کوئی ایسی چیز پیدا نہیں ہوتی جس کی ایسے تعامل کو ضرورت ہو یا یہ تعامل اُس ضرورت سے مستغنی ہو۔ کوئی مخصوص چیز میں کسی حاجت یا حاجت سے استغناء کا اظہار ہوتا ہے، ایسی کوئی چیز نہیں ہوتی جس میں کائنات کی ہر چیز پائی جاتی ہو جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ اس چیز کی

ضرورت ہے یا یہ ضرورت سے مستغنی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کائنات کی تمام چیزیں بحیثیتِ مجموعی یا تو ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہیں یا کسی کی محتاج ہیں تو یہ اُن چیزوں کا بیان ہے جن کا کوئی وجود نہیں ہے بلکہ یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ وہ موجود ہیں یعنی اُن کا وجود ایک مفروضے (Hypothetical) کے طور پر ہے۔ اس مباحثے میں کسی مخصوص چیز کی ضرورت کا ثبوت پیش کیا گیا ہے جو کہ کائنات میں موجود ہے نہ کہ اشیاء کا مجموعہ جس کے بارے میں تصور کر لیا گیا ہے کہ ان کے ملنے سے ایک چیز بنی ہے اور اس کے بعد اس کی یہ صفت بتائی گئی کہ یہ کسی چیز کی محتاج ہے یا اُس سے مستغنی ہے۔ اسلئے اس طرح کا سوال غلط ہے کیونکہ یہ خیالی اور فرضی ہے۔ اسکی کوئی حقیقت نہیں یہاں تک کہ یہ فرض بھی نہیں کیا جا سکتا۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ چیزوں کو ایک دوسرے کی ضرورت پڑتی ہے، اس طرح اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ ایک خالق کی محتاج ہیں، کیونکہ یہاں احتیاج کی صفت کو ثابت کرنا ہے جیسی کہ وہ ہے نہ کہ کسی خالق کی ضرورت کو۔ کسی چیز میں احتیاج کا ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ احتیاج کی صفت ہر چیز میں موجود رہتی ہے۔

یہ کہنا بھی غلط ہے کہ کیونکہ ہر ایک حصہ دوسرے حصہ پر منحصر رہتا ہے، اس طرح تمام اجزاء ایک دوسرے پر منحصر ہوئے، یہاں جو کچھ ثابت کیا گیا وہ یہ ہے کہ ہر چیز دوسری چیز پر منحصر رہتی ہے، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ چیزیں مکمل طور پر محتاج ہیں، ایسا دعویٰ نہیں کیا جانا چاہئے،

کیونکہ چیز کا انحصار چاہے وہ دنیا کی کسی ایک چیز پر ہی کیوں نہ ہو، یہ ثابت کرتا ہے کہ دنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو مکمل طور پر خود کفیل یا مستغنی عن الحاجہ ہو، اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کسی دوسری چیز کی محتاج ہے، چاہے وہ دنیا کی ایک ہی چیز کیوں نہ ہو۔ اس طرح کسی چیز کی احتیاج چاہے وہ ایک ہی معاملے میں کیوں نہ ہو ثابت ہوتی ہے، جس طرح کہ چاہے کوئی شخص ایک قدم ہی چلا ہو وہ چلنا ہی کہلائے گا اور کوئی چاہے ایک لفظ ہی بولے وہ بولنا ہی کہلائے گا۔ اس طرح انحصار، بولنے اور چلنے وغیرہ سے اس زمرے یا قسم کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس طرح کسی مادے کا وجود ایک مرتبہ ثابت ہو جانے سے ہی اُس کی ذات کا وجود بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کسی چیز پر صرف انحصار ثابت کرنے سے، جہاں انحصار سے اس کی صفت (اصل) ظاہر ہو رہی ہو، اِس سے کائنات میں ہر چیز کے انحصار کی صفت ظاہر ہوتی ہے۔ اِسی طرح ہر جزو کا دوسرے جزو پر انحصار، ہر جزو کی انحصار کی صفت یقینی طور پر ثابت کرتا ہے۔ یہ سب زمین پر پائے جانی والی ہر چیز میں محسوس بھی کیا جاسکتا ہے اور سمجھا بھی جاسکتا ہے۔ جہاں تک کائنات، انسان اور حیات کی بات ہے، کائنات سیاروں پر مشتمل ہے اور ہر سیارہ ایک مخصوص نظام کے تحت چل رہا ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ نظام یا تو کائنات کا حصہ ہے، یا اُس کی صفات میں سے ایک صفت ہے یا اِس سے مختلف کوئی چیز ہے، یہاں صرف یہ تینوں ہی امکانات ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک اُسکے کائنات کا حصہ ہونے کا تعلق ہے، یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ جس مدار (Orbit) پر سیارہ بڑھتا ہے وہ متعین ہے سیارے اس سے باہر نہیں جاسکتے۔ مدار ایک سڑک کی طرح ہے اور سیارے کی حیثیت

اُس سڑک پر چلنے والے کی طرح ہے۔ وہ نظام جو اس سیارے کو محض چلاتا ہی نہیں، بلکہ اسے مدار کی حدود میں بھی رکھتا ہے اور اسے باہر نہیں جانے دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظام اُس کا حصہ نہیں ہو سکتا۔ سیارے کا حرکت کرنا بھی اُس کی ذات کا حصہ نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ تو ایک عمل ہے، اُس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ اُس کا حصہ ہو۔ جہاں تک اس دعوے کی بات ہے کہ نظام سیارے کی صفات میں سے ایک صفت ہے، یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ نظام صرف سیارے کا حرکت کرنا نہیں ہے بلکہ یہ حرکت ایک متعین مدار کے اندر محدود رہتی ہے۔ اِسلئے معاملہ صرف حرکت یا جنبش کا نہیں ہے بلکہ یہ حرکت ایک متعین راستے پر ہے۔ یہ بینائی کی طرح نہیں ہے جو کہ آنکھ کی صفات کا ایک حصہ ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آنکھوں کی بینائی ایک مخصوص دائرے میں ہی کام کر سکتی ہے۔ یہ پانی کی طرح ہے جو ایک مخصوص درجۂ حرارت پر بھاپ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس طرح معاملہ سیارے کی حرکت کا نہیں ہے، یا آنکھ کی بینائی کا یا پانی کی تبدیلی کا بھی نہیں ہے، بلکہ معاملہ ایک مخصوص مدار میں سیارے کی حرکت کا، کچھ مخصوص شرائط کے ساتھ آنکھوں کی بینائی کا اور مخصوص درجۂ حرارت پر پانی کی تبدیلی کا ہے۔ یہ بات سیارے، آنکھ اور پانی پر عائد ہوتی ہے۔ یہ ایک نظام ہے اگرچہ کسی چیز کا حرکت میں آنا اُس کی صفات میں سے ایک صفت ہے، یہ حقیقت کے سوائے ایک مخصوص حالت ہے یہ حرکت اُس میں پیدا نہیں ہو سکتی، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ کسی چیز کی صفات میں سے ایک صفت نہیں ہے ورنہ یہ اُس چیز کی صفات میں سے ایک صفت ہو گی جو اپنی حرکت کو خود ہی منظم کر لے گی۔ اگر اس میں اپنے

آپ منظم کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو یہ ایک دوسرے نظام کی منصوبہ بندی کرنے کی اہل ہو جائے۔ جبکہ حقیقت اس کے بر عکس ہے، اسلئے یہ اُس کی صفات میں سے کوئی صفت نہیں ہے۔ کیونکہ نظام کسی چیز کی صفت کا حصہ نہیں ہے اور نہ اُس چیز کا حصہ ہے، تب تو نظام بالکل ہی ایک مختلف چیز ہونا چاہئے۔ حقیقت میں یہ بات کسی چیز کا دوسری چیز پر انحصار ثابت کرتی ہے یعنی خود کائنات ایک نظام پر منحصر ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ کائنات ایک متعین طریقہ سے حرکت کرتی ہے یا یہ ایک اجتماعی صفت ہے جو تمام اجرامِ فلکی کے جمع ہونے سے ظاہر ہوتی ہے۔ ہم ہائیڈروجن اور آکسیجن ایٹم کی مثال پر غور کریں دونوں ہی اپنے اندر کچھ متعین خصوصیات رکھتے ہیں۔ اگر دونوں کو ملا کر کوئی چیز بنائی جائے تو اُس چیز کی اپنی متعین خصوصیات (Properties) ہوں گی۔ یہ خصوصیات اس نئے سالمے (Molecule) کی اپنی صفات ہوں گی جو ہائیڈروجن اور آکسیجن ایٹم کی خصوصیات سے بالکل الگ ہوں گی۔ یہ معاملہ سیاروں اور اجرامِ فلکی سے مختلف ہے۔ یہ اجرام باہم مل کر مختلف صفات کی حامل کوئی نیا جِرم نہیں بنا سکتے۔ بلکہ ہر سیارے کے اندر اپنی خود کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں، ان کی صورتِ حال وہ نہیں ہے جہاں دو اجرام فلکی مل کر ایک نئی چیز بنائیں، سادہ سی بات ہے کہ یہ دونوں باہم مل ہی نہیں سکتے۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ یہ کششِ ثقل (Gravitational Pull) کی وجہ سے ہے کیونکہ ثقل انسانی جسم میں زندگی کی طرح حرکت کا مسئلہ ہے تاہم حرکت زندگی کی صفات میں سے نہیں ہے۔ اگرچہ سیارہ اپنے وزن کی وجہ سے حرکت کرتا ہے، حرکت وزن کی صفات میں سے نہیں ہے، اس سے بڑھ کر وجہ یہ کہ کسی

متعین مدار میں حرکت وزن (ثقل) کی صفات میں سے نہیں ہے۔ اس طرح حرکت سیارے کی ایک صفت ہے جبکہ یہ حرکت متعین مدار کے اندر ایک نظام ہے۔ جہاں تک پانی اور ہوا (Oxygen) کی ضرورت کی بات ہے تو اسے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اِسی طرح زندگی اور خوراک وغیرہ کیلئے انسان کی ضرورت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اسی لئے کائنات، حیات اور انسان محتاج ہیں۔

یہ کہنا بھی غلط ہے کہ کائنات میں وہ چیزیں جو ایک دوسرے پر منحصر ہیں ایک ہی چیز کی مختلف شکلیں ہیں، یعنی یہ سب مادے سے بنی ہیں جو مختلف شکلوں میں موجود رہتا ہے، اِن سب میں ایک ہی چیز ہے یعنی مادہ اور مادہ خود اپنے آپ پر منحصر ہے کسی اور چیز پر نہیں۔ یہ بات غلط ہے کیونکہ مادّہ اپنے آپ کسی اور چیز میں تبدیل نہیں ہو سکتا سوائے اِس کے کہ اُسے مخصوص حالات سے بھی گزارا جائے جس عمل میں کہ کچھ دوسری چیزوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر پانی کو بھاپ میں بدلنا ہو تو اُس کے لئے خاص حرارت کی ضرورت پڑے گی اور اگر انڈے سے چوزہ پیدا کرنا ہو تو اس کے لئے بھی انڈے کو ایک خاص درجۂ حرارت میں ایک معین مدت تک رکھنا پڑے گا۔ یہ مادّہ اپنے آپ کو مختلف شکلوں میں نہیں بدل سکتا جب تک کہ اُسے مخصوص حالتوں میں نہ رکھا جائے جو مادے سے ہٹ کر ہوتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جن کیفیات کی مادّے کو ضرورت پڑتی ہے وہ مادّے سے ہٹ کر ہوتی ہیں، اسلئے مادّہ اپنے آپ کو کسی اور شکل میں بدلنے کیلئے اِن کیفیات کا محتاج رہتا ہے۔ مادہ اُن عوامل کا بھی محتاج رہتا ہے جو اِن حالات کو پیدا کرنے کے

ذمہ دار ہوتے ہیں جن سے مادے میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ نتیجتاً کیونکہ مادہ اِن حالات اور باہری عوامل کے بغیر تبدیل نہیں ہو سکتا، اِسلئے یہ ایسی چیز نہیں ہے جو کسی چیز کی تخلیق کر سکے بلکہ یہ خود ہی تخلیق کی گئی ہے۔ پوری دنیا میں کوئی بھی چیز یا تو خالق ہو گی یا مخلوق اس کے علاوہ تیسری شکل ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ جو چیز دوسرے کی محتاج ہو وہ ازلی نہیں ہو سکتی، کیونکہ جب اِس اصطلاح (ازلی) کا اطلاق کسی چیز پر کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز کسی کی محتاج نہیں، کیونکہ اگر یہ اپنے وجود یا تبدیلی کیلئے کسی دوسری چیز کی محتاج ہے تو یقیناً یہ اپنے وجود اور تخلیق کیلئے بھی کسی دوسری چیز کی محتاج ہوئی۔ اگر اس کو اپنے وجود میں آنے کیلئے کسی باہری چیز کی ضرورت پڑتی ہے تو یہ اپنی تخلیق کیلئے ہی کسی دوسری چیز کی محتاج ہوئی، اس لئے یہ ازلی نہیں ہو سکتی۔ ازلی کی واضح تعریف یہ ہے کہ یہ کسی دوسری چیز کی محتاج نہیں ہو سکتی اور کیونکہ جو چیز کسی کی محتاج ہو وہ ازلی نہیں ہو سکتی۔ یقیناً اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کسی کی مخلوق ہے۔ اب کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ تمام اشیائے محسوسہ محتاج ہیں، اور دوسری چیزوں پر اُن کی احتیاج یقینی امر ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کسی خالق کی مخلوق ہیں، یہ بات قطعی ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ خالق کے وجود کا ثبوت بغیر کسی شک اور شبہ کے ظاہر ہو گیا۔

خالق مخلوق نہیں ہو سکتا، اُسے ازلی ہونا چاہئے۔ اگر خالق کو کسی نے پیدا کیا ہے تو وہ خود مخلوق ہوا خالق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دو ہی شکلیں ممکن ہیں، خالق یا مخلوق، دونوں اپنے آپ میں الگ الگ وجود ہیں۔ جیسا کہ دیکھا جا سکتا ہے خالق کی خصوصیات میں سے ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ تخلیق

نہیں کیا گیا، اسلئے خالق وہ ہوا جسے کسی نے تخلیق نہ کیا ہو۔ یہ کہنا بالکل غلط ہو گا کہ خالق کسی چیز کا تو خالق ہے اور کسی چیز کی مخلوق، کیونکہ یہاں زیرِ بحث مسئلہ کسی مخصوص چیز جیسے آدمی اور مشین کے بارے میں نہیں ہے بلکہ یہ تخلیق اور خالق کے بارے میں ہے جس کو کسی نے پیدا نہیں کیا۔ خالق ایک ہی وقت میں خالق اور مخلوق دونوں نہیں ہو سکتا، کیونکہ خالق ایسی ہستی ہے جسے تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک ازلی ہونے کی بات ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا کوئی نقطۂ آغاز نہیں، کیونکہ اس کی شروعات یا نقطۂ آغاز ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ اُس کی تخلیق کسی خاص متعین وقت میں ہوئی ہے۔ خالق کے معنی ہوئے ازلی کیونکہ ازلی کا مطلب یہ ہے کہ تمام چیزیں اُس کی محتاج ہیں اور وہ کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ اس طرح ازلی اور خالق معنی ہوئے اللہ کے یعنی خالق ہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ جہاں تک عقل کی بات ہے تو وہ چیزیں جن کا عقل ادراک کر سکتی ہے، انسان، حیات اور کائنات ہیں۔ یہ پہلے ہی ثابت کیا جا چکا ہے کہ یہ تمام چیزیں محدود ہیں یعنی یہ کسی کی مخلوق ہیں۔ انسان کی تخلیق ہوئی ہے اور ہر پہلو سے اس کی نشوونما ایک حد تک ہوتی ہے، اس سے آگے وہ جا نہیں سکتا۔ کیونکہ اپنی مشترکہ امتیازی خصوصیات کے اعتبار سے انسان کی ایک قسم ہوئی تو بحیثیت انسان کے دو انسانوں میں اُن کی خصوصیات کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوا۔ اس طرح جس چیز کا اطلاق ایک انسان پر ہو گا اس کا اطلاق دوسرے انسان پر بھی ہو گا۔ اس عام اصول کا اطلاق ہر چیز پر ہو گا جیسے سونا، جانوروں میں شیر یا پھلوں میں سیب وغیرہ۔ اس طرح جس بات کا اطلاق عمومی طور پر ایک چیز یا قسم پر ہو گا، اس کا اطلاق اس چیز کے ہر حصہ پر

ہو گا۔ مثلاً ہر آدمی جو زندہ ہے اُسے مرنا ہے، یعنی وہ محدود ہے، اس حقیقت کو تسلیم کرنے کا مطلب اس نظریے کو تسلیم کرنا ہے کہ آدمی محدود ہے۔ یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ہر زمانے میں لاکھوں لوگ مرتے ہیں لیکن اس کے باوجود زمانے کے ساتھ انسانوں کی تعداد لگاتار بڑھتی رہتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انفرادی حیثیت سے انسان مر سکتا ہے جبکہ نسلِ انسانی میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح آدمی کی ایک مخصوص قسم ہے جس کی مکمل نمائندگی افراد کے ذریعہ ہوتی ہے، یہ تمام ہی افراد اپنے اندر یکساں انسانی خصوصیات رکھتے ہیں جس طرح دوسری قسمیں مثلاً پانی، تیل، کوئی بھی جانور یا درخت۔ اسلئے کسی بھی چیز کے بارے میں کوئی فیصلہ درحقیقت اُس کی مجموعی تعداد پر ہی مرتکز نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس قسم میں شامل ہر ذات پر ہونا چاہئے اور جس چیز کا بھی اطلاق اُس قسم کی ایک ایک چیز پر ہو گا، اُس کا اطلاق اُس پوری قسم پر کیا جا سکتا ہے قطع نظر اس سے کہ اس قسم میں اُن کی تعداد کتنی ہے۔ اس طرح انسانی نسل کی مکمل شناخت ایک فردِ انسانی سے کی جا سکتی ہے، اسلئے جب ایک انسان مرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ذات یا اُس آدمی کی شناخت ختم ہو گئی۔ بحیثیت انسان کے ہم جو کچھ مشاہدہ کرتے ہیں اُسی کو سب کچھ نہیں سمجھ لینا چاہئے کیونکہ یہ تو ایک چیز کا مشاہدہ ہے اس سے ہٹ کر جو کہ ہمیں جانچنا تھا۔ یہ تو مجموعی افراد کا مشاہدہ ہے نہ کہ اس کی قسم کا، اس کے علاوہ یہ ایک نامکمل مشاہدہ ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ سمندر سے کتنا ہی پانی نکال لیا جائے اس کا پانی ختم نہیں ہوتا، اسی طرح زمین میں سے کتنا ہی تیل نکال لیا جائے وہ ختم نہیں ہوتا اور گیہوں کی کھپت میں ہمیشہ اضافے کے باوجود اُس

کی مقدار بڑھتی جاتی ہے۔ اگر ہم اس کے کل مجموعے کو دیکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ قسم کبھی ختم نہیں ہوتی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی چیز کی ایک اکائی مر جائے یا ختم ہو جائے تو وہ قسم مجموعی طور پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح جب ایک انفرادی شخص مرتا ہے تو بحیثیتِ مجموعی نسلِ انسانی میں کمی واقع ہو جاتی ہے، اسی لئے انسان محدود ہے۔

زندگی بھی محدود ہے اور حواس سے اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ ہر فرد میں یہ ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح زندگی محدود ہے۔ جہاں تک زندگی کا تعلق ہے یہ انسان اور حیوان دونوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔ کسی فرد سے علیحٰدہ ہٹ کر آزادنہ طور پر اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا، بلکہ یہ فرد کے اندر ہی رہتی ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جسے محسوس کیا جا سکتا ہے چھوا نہیں جا سکتا۔ زندہ اور مردے میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ محسوس چیز جو کسی زندہ چیز میں موجود رہتی ہے اور جس میں حرکت اور نشوونما اس کی علامتیں ہیں جن سے اس کی زندگی کا اظہار ہوتا ہے جسے اور کسی دوسری چیز سے نہیں ملایا جا سکتا۔ یہ چیز ہر زندہ فرد کے ساتھ ہے اور ہر انسان میں اُسے دیکھا جا سکتا ہے۔ اسلئے جب کسی فرد کے اندر زندگی ختم ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ متعین زندگی ختم ہو گئی، اسی لئے زندگی محدود ہوئی۔

کائنات بھی محدود ہے کیونکہ یہ اجرامِ فلکی کا مجموعہ ہے جس کا ہر جِرم محدود ہے۔ کیونکہ ہر سیارہ ایک مخصوص حجم اور شکل کا ہوتا ہے، محدود اشیاء کا مجموعہ بھی ہمیشہ محدود ہی رہتا ہے قطع نظر اس

سے کہ اُن کی تعداد کتنی ہے۔ سیاروں کی محدودیت اُن کی تعداد کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کی وجہ سے ہے کہ سیاروں کا ایک نقطۂ آغاز ہوتا ہے اور اُن کا خاتمہ بھی طے ہے یعنی اُن کی شروعات اور اُن کا ختم ہونا۔ نقطۂ آغاز کی موجودگی اُن کے محدود ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔ کیونکہ جو چیز بھی اپنی عمر اور حجم میں بڑھتی ہے وہ محدود ہوتی ہے، یہ اضافہ ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ آگے بھی اس کی ایک حد مقرر ہے، اسلئے اس کا مجموعہ محدود ہی رہے گا۔ اسلئے کائنات اپنے آپ میں محدود ہے نتیجتاً انسان، حیات اور کائنات سب محدود ہیں۔

جب ہم محدود چیز پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ازلی نہیں ہے ورنہ یہ محدود نہ ہوتی، کیونکہ کسی بھی محسوس چیز کی یا تو ابتداء ہوتی ہے اسلئے وہ ازلی نہیں ہوتی یا اس کی ابتداء نہیں ہوتی اسلئے وہ ازلی ہے۔ ہم یہ پہلے ہی ثابت کر چکے ہیں کہ ہر محدود چیز کی کہیں ابتداء ہوتی ہے اسلئے وہ ازلی نہیں ہوئی کیونکہ ازلی اصطلاح کے معنی ہی یہ ہیں کہ جس کی ابتداء نہ ہو۔ اس طرح جس چیز کا بھی کوئی آغاز نہ ہو گا اس کا خاتمہ بھی نہ ہو گا کیونکہ کسی چیز کے خاتمے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اُس کی کہیں سے شروعات ہوئی ہے۔ کسی چیز کا آغاز کسی متعین نقطہ سے ہی ہو سکتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا ایک نقطۂ اختتام بھی ہونا چاہئے چاہے وہ وقت کی شکل میں ہو یا جگہ کی۔ اشیاء محسوسہ اور اُن چیزوں میں جو قابلِ ادراک ہیں یہ ناگزیر بات ہے۔ اسلئے ہر وہ چیز جس کی کوئی ابتداء ہوتی ہے یا جس کا کوئی نقطۂ آغاز ہوتا ہے اس کا خاتمہ یا نقطۂ انجام بھی ہوتا ہے۔ ازلی اصطلاح کا مطلب ہے جس کی نہ کوئی ابتداء ہو نہ انتہاء۔ اسلئے کوئی محدود چیز ازلی نہیں ہوتی اور اسکا اطلاق

انسان، کائنات اور حیات پر ہوتا ہے۔ اس حقیقت کا مطلب کہ یہ ازلی نہیں ہے، یہ ہوا کہ یہ خود اپنے علاوہ کسی اور کے ذریعہ تخلیق کی گئی ہیں۔ اس کا دوسرا عامل خالق ہے یعنی انسان، حیات اور کائنات کا خالق اور انسان، حیات اور کائنات کا وجود ایک خالق کے وجود کو بھی ثابت کرتا ہے۔ یہ خالق یا تو کسی اور خالق کے ذریعہ تخلیق کیا گیا ہے یا خود اس نے اپنے آپ کو تخلیق کیا ہے، یا یہ ازلی ہے اس کے علاوہ اور کوئی شکل ممکن نہیں۔ یہ کہنا کہ اسے کسی نے تخلیق کیا ہے صحیح نہیں ہے کیونکہ اس طرح وہ خالق محدود ٹھہرے گا، ایسا ہو نہیں سکتا یہ پہلے ہی ثابت کیا جا چکا ہے۔ یہ کہنا کہ خالق نے خود اپنے آپ کو تخلیق کیا ہے بہت ہی بے وقوفی کی بات ہے کیونکہ ایسی حالت میں وہ خود اپنا ہی خالق ہوا یعنی خود ہی خالق بھی اور خود ہی مخلوق بھی۔ اسلئے خالق کو ازلی ہونا چاہئے یعنی جس کی نہ کوئی ابتداء ہو نہ انتہاء۔ خالق کسی اور کا محتاج نہیں ہوتا جبکہ ہر چیز اسکی محتاج ہوتی ہے۔ یہ بات لفظ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی نشاندہی کرتی ہے اور یہی اس لفظ کے معنی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں جو خصوصیات بھی ازلی کی ہونا چاہئے وہی خالق کی بھی ہیں اور یہی اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ کے وجود کا ادراک اپنے حواس کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ قابلِ محسوس حقیقت ہے۔ تاہم اس ازلی ہستی کی ذات جسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے نام سے جانا جاتا ہے، ہم اسے محسوس نہیں کر سکتے کیونکہ دماغ اُس کی ذات کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔ تاہم یہ کہنا بھی غلط ہے کہ یہ ایک انجان چیز پر ایمان لانا ہے کیونکہ اللہ انجانا ہے، وہ اپنی خصوصیات اور صفات کے ذریعہ جانا جاتا ہے۔ یہ ایمان یا یقین کسی انجانی چیز پر نہیں بلکہ جانی پہچانی چیز پر ہے۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ ازلی وہ ہے جسے ہم

نے سمجھا کیونکہ اس کی کوئی ابتداء نہیں ہے اور اس کے باوجود انسانی دماغ اس ازلی ذات کا ادراک نہیں کر سکتا، وہ تو صرف اس کے وجود کا ادراک کر سکتا ہے۔ یہ کہنا بھی بالکل غلط ہے کہ آدمی کو اُس چیز پر ایمان لانے کیلئے مجبور کیا گیا ہے جس کا وہ ادراک نہیں کر سکتا، کیونکہ جس کو تسلیم کرنا اور جس پر ایمان لانا، انسان پر فرض قرار دیا گیا ہے وہ خالق کے وجود کا ادراک ہے۔ تمام اشیاء محسوسہ کے وجود سے اس کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح جو کچھ دماغ کو ضرورت پڑتی ہے وہ ایک محسوس حقیقت ہے۔

عقلی طریقے سے کسی چیز کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ وہ چیز دماغ کے ادراک کے دائرے سے باہر نہ ہو ورنہ یہ ناممکن ہے کہ اس طریقے سے کسی نتیجے پر پہنچ پائیں۔ کسی اور نتیجے پر پہنچنے کیلئے دوسرے طریقے کی ضرورت پڑے گی۔ مثلاً ایک سائینسداں ایٹم کو تقسیم کرنے کے لئے کوئی عقلی تجربہ کر سکتا ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ وہ اس طریقے سے اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان لے آئے۔ اس کے لئے کسی اور چیز کی ضرورت پڑے گی۔ اسلئے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہوئی کہ ایک غیر معمولی ذہین آدمی نے کہ بہت صحیح تجربات کے ذریعہ حساب لگا کر بہترین ممکنہ نتائج نکالے ہوں مثلاً ایٹم کا سائینسداں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہی آدمی گرجاگھر جا کر ایک بے جان لکڑی کے ٹکڑے کی عبادت کرتا ہے اور اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ تین ایک ہے اور ایک تین اور یہ کہ عیسیٰ مسیح اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہوتا کیونکہ یہاں اس نے اپنے ذہن کو اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی صفات اور خصوصیات کو سمجھنے کیلئے استعمال ہی نہیں کیا۔ اس نے

اپنی عقل ایٹم کو تقسیم کرنے میں استعمال کی اور اسے سائنسی تجربوں تک ہی محدود رکھا۔ اس ذہنیت کی وجہ سے یہ کوئی انہونی بات نہیں لگتی کہ ایک سائنسداں جو بہت انہماک سے پیڑ پودوں کا مطالعہ کر رہا ہے، تخلیق کی باریکیاں اور حکمت و دانائی کو دیکھتا ہے لیکن اسکے باوجود وہ اس فطری نتیجے پر پہنچنے میں ناکام رہتا ہے کہ اللہ کا وجود ہے۔ اس کے بجائے وہ دہریہ ہی رہتا ہے جو اللہ کے وجود سے انکار کرتا ہے۔ ایسا رویہ غیر معمولی نہیں ہے کیونکہ سائنسداں نے پیڑ پودوں کا مطالعہ کرتے وقت جو عقلی طریقہ استعمال کیا اس کا مقصد صرف صحیح معلومات حاصل کرنا تھا۔ اس طریقے سے صحیح نتیجہ تو یہ نکلے گا کہ تخلیق کی یہ باریکیاں اتفاقیہ یا حادثاتی طور پر ممکن نہیں ہیں بلکہ یہ ایک خالق کے عملِ تخلیق کے ذریعہ ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ اس فہم کے لئے ایک دوسرے عقلی طریقے کی ضرورت پڑتی ہے جو کہ سائینسداں استعمال نہیں کرتا، اس کے نزدیک ایک خالق کا وجود زیرِ بحث ہی نہیں آتا۔ اسلئے سائنسی طریقے سے کسی سائنسداں کا اللہ تعالیٰ کے وجود پر یقین نہ کرنا کوئی قابلِ تعجب بات نہیں ہے۔ جب کوئی انسان اپنا دماغ اس متن (Text) کے مطالعہ میں لگاتا ہے جس سے قانون وضع کیا گیا ہے تو اس وقت اس بات پر دھیان نہیں دیا جاتا کہ وہ حل جو اس متن سے نکالا گیا ہے وہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ دماغ صرف اس میں لگایا جاتا ہے کہ متن میں دی گئی صورتِ حال کے مطابق مختلف مسائل کا کیا حل اس میں بتایا گیا ہے نہ کہ اس پر غور کریں کہ وہ حل غلط ہے یا صحیح۔ یہ سمجھنے کیلئے کہ حل صحیح ہے یا غلط ایک اور عقلی طریقے کی ضرورت پڑتی ہے جس میں اس متن کے بجائے حل کے دلائل کیلئے خود اپنا دماغ استعمال کیا جاتا ہے قطع نظر اس

سے کہ اس متن میں قانون سازی اللہ تعالیٰ نے کی ہے یا انسان نے۔ اس طرح جب مغربی دیوانی قانون کی کسی دفعہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو دماغ اس بات پر لگایا جاتا ہے کہ یہ قانون کس چیز کے متعلق ہے نہ کہ اس پر غور کیا جائے کہ یہ قانون صحیح ہے یا غلط۔ یہ جاننے کیلئے کہ آیا یہ تدبیر صحیح ہے یا غلط ایک اور عقلی طریقے کی ضرورت پڑتی ہے جس میں متن کے بجائے دماغ سے دلائل کا استنباط کیا جاتا ہے چاہے وہ متن اللہ تعالیٰ کے قانون سے ہو یا انسان کے بنائے ہوئے قانون سے۔ اس معاملے میں متن کے معانی یا فہم کو سمجھنے کیلئے عقل کو مطمئن کر دینے والے دلائل ہونا چاہئے نہ کہ متن کے دلائل۔ متن کے معانی اور مفہوم کو سمجھنے کیلئے دماغ کے بجائے خود متن کو دلیل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ دماغ سے متعلق ایک ناگزیر معاملہ ہے۔ اسلئے اسلام میں کچھ متعین نتائج کو اخذ کرنے کیلئے جب انسان اپنا دماغ لگاتا ہے تو اُسے عقیدے کے معاملے میں ایمان کے تعلق سے کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے اور احکامِ شریعہ کو سمجھنے کیلئے شرعی متن میں دماغ لگانے میں امتیاز کرنا چاہئے۔ جب عقیدے کو سمجھنے یا اس کا تعین کرنے میں عقل استعمال کی جاتی ہے تو اس کا جو نتیجہ بر آمد ہوتا ہے اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ نظریہ صحیح ہے یا نہیں، کیونکہ یہاں عقل یہ سمجھنے میں استعمال کی گئی کہ یہ نظریہ صحیح ہے یا نہیں۔ جب احکامِ شریعہ کے تعین کرنے میں عقل لگائی جاتی ہے تو اس پر دھیان دیا جاتا ہے کہ اصلاً حکمِ شرعی کیا ہے نہ کہ ہم یہ دیکھیں کہ حکمِ شرعی صحیح ہے یا غلط۔ ضرورت اس کی ہے کہ متن سے استنباط شدہ حکم پر غور کیا جائے اور اس کا لحاظ رکھا جائے کہ یہاں دلیل متن

سے لی جائے گی نہ کہ انسانی دماغ سے۔ اسلئے دماغ کا استعمال شرعی حکم کو سمجھنے تک محدود رہے گا اس سے باہر نہیں۔ انسانی عقل یہ طے نہیں کرتی نہ کر سکتی ہے کہ یہ شرعی احکام صحیح ہیں یا غلط کیونکہ احکام استنباط کرنے کی یہ بنیاد ہی نہیں ہے۔ دلائل و شواہد صرف شرعی متن سے لئے جائیں گے چاہے اس میں ان کی علّت بتائی گئی ہو یا نہ بتائی گئی ہو۔ جو کچھ شرعی متن میں سے سمجھنا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اصل میں بات کیا کہی گئی ہے نہ کہ ہم اس پر غور کرنے بیٹھ جائیں کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ جہاں تک عقیدے کی بات ہے تو وہاں انسان کو اپنی عقل اس میں لگانا چاہیئے کہ یہ عقیدہ صحیح ہے یا نہیں۔ عقیدے کو عقل کی کسوٹی پر پورا اترنا چاہیئے۔ یہ طریقہ ہے اسلام میں عقل کو استعمال کرنے کا۔ عقلی طریقہ عقیدے کے معاملے میں دلیل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور اس طریقے سے ہی عقل فیصلہ کرتی ہے کہ عقیدہ صحیح ہے یا نہیں۔ انسانی دماغ صرف شرعی متن میں استعمال کیا جاتا ہے تا کہ ہم حکمِ شرعی کو سمجھیں اس کے علاوہ نہیں۔ اسلئے کہ دماغ عقیدے کو اور قرآن اور سنت کو سمجھنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں تک شرعی احکامات کی بات ہے، اس کے لئے انسانی دماغ سے کوئی دلیل نہیں دی جا سکتی، اس کے لئے صرف شرعی متن اپنی اصلی حالت میں استعمال کیا جائے گا یعنی قرآن اور سنت اور جو کچھ ان میں سے استنباط کیا گیا ہے جیسے اجماعِ صحابہ اور قیاس۔ کسی بھی معاملے میں عقیدے سے متعلق شرعی دلیل بالکل قطعی ہونا چاہیئے۔ یہ شرعی احکامات سے مختلف ہے جہاں لی گئی دلیل ظنی ہو سکتی ہے، کیونکہ عقیدے کے افکار وہ بنیاد ہیں جن پر ہر مسلمان کی نظر میں اسلام قائم ہے اور اسلام پر ہی ان کی زندگی کے معاملات کا انحصار

ہے۔ اسی لئے اسلام نے یہ فرض قرار دیا ہے کہ جو افکار عقیدے سے لئے گئے ہوں وہ فیصلہ کن اور متعین ہوں اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس عقیدے کی دلیل اور ثبوت قطعی ہوں۔ اسلام میں عقیدہ ایک قطعی یقین ہے جو حقیقت اور سچائی سے مطابقت رکھتا ہے اور اگر وہ یقین قطعی نہیں ہے تو اسے اسلامی عقیدے سے نہیں سمجھا جائے گا۔ مزید یہ کہ جو قطعی یقین حقیقت کے مطابق نہ ہو وہ اسلامی عقیدے کا جز نہیں مانا جائے گا۔ عقیدے سے مستنبط افکار کیلئے دو شرائط ضروری ہیں، پہلا یقینِ کامل دوسرے فکر کی حقیقت سے ہم آہنگی۔ اسلامی عقیدے سے لئے گئے افکار کیلئے ان دونوں شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ قرآنِ مجید کی آیات میں واضح طور پر اس کی نشاندہی کی گئی ہے کہ عقیدے کو یقینِ کامل کے ساتھ قبول کرنا چاہئے اور اس بات کیلئے صاف منع کیا گیا ہے کہ عقیدے کے معاملے میں ظن و گمان سے کام لیا جائے۔

ارشادِ باری تعالی ہے:

﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ لَا يُؤۡمِنُونَ بِٱلۡـَٔاخِرَةِ لَيُسَمُّونَ ٱلۡمَلَـٰٓئِكَةَ تَسۡمِيَةَ ٱلۡأُنثَىٰ (٢٧) وَمَا لَهُم بِهِۦ مِنۡ عِلۡمٍۖ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا ٱلظَّنَّۖ وَإِنَّ ٱلظَّنَّ لَا يُغۡنِي مِنَ ٱلۡحَقِّ شَيۡـًٔا (٢٨)﴾

”جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کو دیویوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں، حالانکہ اس بارے میں اُنہیں کچھ علم نہیں۔ وہ محض گمان کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ حق سے جو فائدہ پہنچتا ہے وہ گمان سے کچھ بھی نہیں پہنچتا“۔ (النجم:53:27،28)

﴿إِنْ هِيَ إِلَّآ أَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوهَآ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُم مَّآ أَنزَلَ ٱللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَـٰنٍ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا ٱلظَّنَّ وَمَا تَهْوَى ٱلْأَنفُسُ ۖ وَلَقَدْ جَآءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ ٱلْهُدَىٰٓ ( ٢٣) ﴾

”وہ تو بس کچھ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں، اللہ نے اُن کیلئے کوئی سند نہیں اتاری وہ تو محض گمان کی پیروی کرتے ہیں اور اسکی جو اُنکے نفسوں کی چاہت ہے حالانکہ اُن کے پاس اُن کے رب کی طرف سے ہدایت آچکی ہے“۔(سورہ النجم؛53:23)

﴿ وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي ٱلْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا ٱلظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ﴾

”اور زمین میں اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر تم اُن کے کہنے پر چلے تو وہ اللہ کے راستے سے تمہیں بھٹکا دینگے، وہ تو بس اٹکل اور گمان کے پیرو ہیں، اور وہ محض اٹکلیں ہی دوڑاتے ہیں“۔(سورہ الأنعام؛6:116)

مزید ارشاد ہے:

﴿ وَمَا يَتَّبِعُ ٱلَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ شُرَكَآءَ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا ٱلظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (٦٦) ﴾

”جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسرے شریکوں کو پکارتے ہیں وہ آخر کس کی پیروی کرتے ہیں، وہ تو محض گمان کی پیچھے چلتے ہیں، اور محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں“۔(سورہ یونس؛10:66)

یہ آیات ثابت کرتی ہیں اور یہ اس بات کی شرعی دلیل ہیں کہ عقیدے کی بنیاد یقینِ کامل پر ہونا چاہئے نہ کہ ظن و گمان پر۔ ان آیات کو دلیل کے طور پر پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ عقیدے سے متعلق ہیں اور یہاں موضوعِ بحث عقیدے تک محدود ہے۔ مزید یہ کہ جو لوگ گمان کی بنیاد پر عقیدہ قائم کر لیتے ہیں ان کی اللہ تعالیٰ نے سرزنش کی ہے اور انہیں جھوٹا قرار دیا ہے۔ گمان پر عقیدے کی بنیاد ہونے پر سرزنش کرنے کا واضح مطلب یہ ہوا کہ اس کے لئے قطعی طور پر منع کیا گیا ہے۔ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں کرتے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ کسی علم کی بنیاد پر ایسا نہیں کرتے یعنی اُن کو اس کا قطعی یقین نہیں ہے کہ آخرت نہیں ہو گی بلکہ وہ صرف گمان کی بنیاد پر ایسا کرتے ہیں۔ ان آیات کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حقیقت اور سچائی کے مقابلے میں گمان اور ظن کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اُن لوگوں کے متعلق جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ فرشتے عورتیں ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کا یقین سچائی پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ تو اٹکلیں لگاتے ہیں اور بس اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ اس قیاس و گمان کے نتیجے میں جو گمراہی اور ضلالت پیدا ہوتی ہے اسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے کفر سے تعبیر فرمایا ہے اور جو جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو بتوں کی پوجا کرتے ہیں اُن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ کی عبادت کرنا اور اس کی طرف بتوں کو منسوب کرنا اور یہ یقین رکھنا کہ یہ اُن کو کسی قسم کا فائدہ پہنچا سکتے ہیں تو دراصل یہ ظن و گمان کا اتباع کرنا اور اللہ کے نام پہ جھوٹ گھڑنا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ آیات عقائد سے متعلق ہیں۔ اِن آیات میں اُن لوگوں کی بھی سرزنش کی گئی

ہے جو اپنے عقیدے کی بنیاد قیاس و گمان پر رکھتے ہیں نہ کہ یقین پر، اُنہیں جھوٹا اور اپنی خواہشات کا بندہ بتایا گیا ہے اور جس چیز کا بھی یہ اتباع کرتے ہیں اس سے انہیں کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ ان سب سے یہ واضح حکم معلوم ہوتا ہے کہ عقیدہ ایک متعین یقین اور قطعی علم کی بنیاد پر ہونا چاہئے اور اسی کے ساتھ قیاس و گمان کی بنیاد پر عقیدہ قائم کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس سے اس بات کی بھی صاف نشاندہی ہوتی ہے کہ جن لوگوں کے عقیدے کی بنیاد قیاس و گمان ہوتی ہے انہیں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ہاں اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ ان لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنے عقیدے کی باریکی سے جانچ اور تحقیق کریں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ ان کے عقیدے کی بنیاد بالکل سچ اور یقین پر ہو تاکہ اسکے شواہد حتمی ہوں نہ کہ ظنی۔

اس طرح عقیدے سے متعلق افکار قطعی دلیل کی بنیاد پر ہونا چاہئے نہ کہ ظنی دلیل کی بنیاد پر چاہے وہ دلیل شرعی ہو۔ وہ شخص جس کے عقیدے کی بنیاد قیاسی دلائل پر ہو گی اس پر ہم کفر کا الزام نہیں لگا سکتے کیونکہ جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اِن آیات میں اس پر ملامت کی تو اس میں یہ نہیں فرمایا کہ وہ گمراہ یا کافر ہو گیا، بلکہ صرف یہ کہا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور اپنی خواہشات کی پیروی کر رہا ہے اور جس چیز کی وہ پیروی کر رہا ہے اس سے اسے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اس سے وہ کافر نہیں بن جائے گا بلکہ وہ گنہگار ہو گا اور اپنے عقیدے کی بنیاد گمان پر رکھ کر وہ حرام کا مرتکب ہو گا، کیونکہ اس نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یقین کی بنیاد پر عقیدہ قائم کرنے کو فرض قرار دیا ہے جبکہ اس نے اپنا عقیدہ گمان کی بنیاد پر قائم کیا۔ اس طرح

اس نے وہ کیا جس سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے واضح طور پر منع فرمایا تھا اسی لئے اس نے حرام کام کا ارتکاب کیا۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قطعی طور پر گمان کی بنیاد پر عقیدہ قائم کرنے کو منع فرمایا تھا لیکن اس نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح انفرادی طور پر اور معاشرے میں اسلام کو قائم کرنے کی وضاحت کر دی گئی۔ جہاں تک اُن حتمی دلائل کی بات ہے جن سے عقیدہ لیا گیا ہے، اسلام کے شرعی دلائل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس کے حتمی دلائل تین زمروں تک محدود ہیں جو اس طرح ہیں۔ عقلی دلائل، قرآن مجید اور احادیثِ متواتر جن کے بارے میں یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی فرمایا ہے۔ عقیدہ اِن تینوں کے علاوہ اور کسی چیز سے نہیں لیا جاتا۔ ان کے علاوہ کہیں اور سے عقیدہ لینا منع ہے کیونکہ باقی چیزیں ظن و گمان ہوں گی نہ کہ یقینی۔

جہاں تک احکام کی بات ہے، ان کو اختیار کرنے کے لئے حتمی دلائل کی شرط نہیں ہے بلکہ اُن کیلئے یہ کافی ہے کہ وہ ظنی ہوں۔ جب کسی مسلمان کو ذرا سا بھی شک ہو کہ یہ کسی معاملہ میں اللہ کا حکم ہے تو اس کو چاہیئے کہ وہ اس کا اتباع کرے، اصل میں یہ اس کے تعلق سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا حکم ہے۔ اسلئے جب ہم کسی ایسی آیتِ قرآنی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے ایک سے زیادہ معنی نکل سکتے ہوں تو اس سے ظنی دلیل کی بنیاد پر ایک حکمِ شرعی سمجھ میں آتا ہے۔ ایک شخص اس سے مخصوص معنی مراد لیتا ہے، دوسرے شخص کی رائے میں اس کا کچھ اور مفہوم ہوتا ہے۔ یہ دونوں احکامِ شرعی جائز ہیں۔ اس اصول کا اطلاق حدیثِ متواتر پر بھی ہوتا ہے۔ اگر اس کے کئی مفہوم سمجھ میں آ رہے ہوں، اس سے جو شرعی حکم نکل رہا ہو اس کی دلیل ظنی ہو گی۔ اسی طرح

حدیثِ غیر متواتر اپنے مفہوم کے اعتبار سے ظنی ہوتی ہے قطعی نہیں۔ یہ حکم شرعی کے لئے ایک دلیل ہے جو کہ ظنی ہے چاہے اس کے الفاظ سے ایک معنی نکل رہے ہوں یا ایک سے زائد۔ تاہم اس سے جو حکم شرعی نکل رہا ہو اسے اختیار کرنے کی ایک شخص کو اجازت ہے۔ کسی حکم کو اختیار کرنے کیلئے ظنی دلیل کافی ہوتی ہے۔ بخاری شریف میں نافع سے روایت ہے حضرت ابنِ عمر نے کہا کہ جنگ احزاب کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(لَا يَصلينَ اَحَدَكُم العَصر اِلا فِي بَنِي قُرَيظَة)

”تم میں سے کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے جب تک کہ بنی قریظہ نہ پہنچ جائے“

دورانِ سفر بنی قریظہ پہنچنے سے قبل ہی عصر کا وقت ہو گیا، کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم تو عصر کی نماز پڑھ لیتے ہیں کیونکہ بنی قریظہ پہنچنے تک نماز قضاء ہو جائیگی جبکہ کچھ اور لوگوں نے کہا کہ ہم بنی قریظہ پہنچ کر ہی عصر پڑھیں گے۔ مطلب یہ کہ جن لوگوں نے نماز پڑھی ان کا یہ کہنا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وقت ہو جانے کے باوجود نماز نہیں پڑھیں بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت تک بنی قریظہ پہنچ جائیں۔ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی گئی تو انہوں نے دونوں میں سے کسی عمل پر بھی اعتراض نہیں کیا یعنی دونوں کے عمل کو منظوری دی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکوک معاملے میں بھی شرعی حکم کو اختیار کرنے کی بات کو تسلیم کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی وقت میں بارہ آدمیوں کو بارہ بادشاہوں کے پاس اپنا پیغام دے کر بھیجا جس میں اسلام کی طرف دعوت دی گئی

تھی۔ ہر سفیر کو انفرادی طور پر ایک ایک علاقہ میں بھیجا گیا تھا۔ اگر فردِ واحد کے ذریعہ دعوت کو پہنچانا ضروری نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی آدمی کو دعوت دینے کیلئے بھیجنے پر اکتفاء نہ کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ایک فرد کے ذریعہ دی گئی اطلاع یعنی خبرِ واحد کو تسلیم کیا گیا جبکہ ہم جانتے ہیں کہ ایک شخص کی دی ہوئی اطلاع ظنی ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے والیوں کے پاس واحد سفیر کے ذریعہ ہی خطوط بھیجے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی ایک والی نے بھی یہ سوچ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو نظر انداز کیا ہو کہ سفیر تو ایک فردِ واحد ہے، بلکہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آئے ہوئے احکامات اور ہدایات پر پوری طرح عمل کیا۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خبر واحد کی بنیاد پر حکم شرعی پر عمل درآمد فرض ہے۔ چاہے وہ حکم کسی کام کو کرنے کے تعلق سے ہو یا نہ کرنے کے تعلق سے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے والیوں کے پاس تنہا شخص کو بھیجنے پر اکتفاء نہ کرتے جبکہ یہ بات عام ہے کہ ایک فرد کی دی ہوئی اطلاع ظنی ہوتی ہے۔ ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی معاملے میں معمولی شبہ بھی ہو تو وہ احکامِ شرعی کو تسلیم کرنے کیلئے کافی ہے۔

احکام شرعیہ میں ہماری زندگی کے مسائل کا حل ہے یعنی ان سے اسلامی قانون سازی کی گئی ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ وہ احکامات ہیں جو بحیثیت انسان کے انسانوں کے عمل در آمد کیلئے ہیں۔ اس طرح اسلامی قانون سازی کا مطالعہ دراصل احکامِ شرعیہ کا مطالعہ ہے۔

اسلامی قانون سازی کو مغربی قانون سازی کے طریقہ سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ یقیناً یہاں اس بات کی بالکل اجازت نہیں ہے کہ اسے موضوعِ بحث بنایا جائے چاہے وہ کسی حکم کو قبول کرنے کے تعلق سے ہو یا رد کرنے کے تعلق سے، بلکہ یہ انسانوں اعمال کو موضوعِ بحث بناتا ہے۔ اس طرح شریعت اسلئے آئی ہے کہ وہ یہ بتائے کہ انسان کونسا عمل کرے اور کونسا نہ کرے۔ یہ اسلئے نہیں آئی کہ وہ آزادی کو تسلیم کرے یا رد کرے۔ یہ انسان کو اس نظر سے نہیں دیکھتی کہ وہ آزادی کی بنیاد پر کوئی سا عمل کرے یا نہ کرے۔ اس کے بجائے اسلام یہ بتاتا ہے کہ انسان جو بھی عمل کرتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ اس کے تعلق سے حکم شرعی کیا ہے اسی لئے اس نے کچھ کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے جن کا کرنا فرض ہے اور اُن کاموں کو نہ کرنے والوں کیلئے سزا مقرر کی ہے جس کا نفاذ ریاست کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اسی طرح شریعت میں کچھ کاموں کے کرنے کا منع کیا ہے اور ایسے کاموں کے کرنے والے یعنی حرام کام کے مرتکب افرد کیلئے سزا مقرر کی ہے جس کا نفاذ بھی ریاست کی طرف سے ہوتا ہے۔ اسلام نے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے والوں یا حرام کام کرنے والوں کیلئے قیامت کے دن سزا کی وعید سنائی ہے۔ اسلام نے کچھ اعمال کے انجام دینے کو پسند کیا ہے اور چاہا ہے کہ یہ کام کئے جائیں مگر ان کاموں کے نہ کرنے والوں پر نہ تو ریاست کی طرف سے کوئی دنیوی سزا مقرر کی گئی ہے اور نہ اِن کے چھوڑنے پر قیامت کے دن کوئی سزا ہے۔ یہ پسندیدہ اعمال مندوبات کہلاتے ہیں۔ اسلام نے کچھ ایسے اعمال بھی بتادئے ہیں جو ناپسندیدہ ہیں اور یہ چاہا گیا ہے کہ اِن سے بچا جائے لیکن ایسے کاموں

کے کرنے والوں پر ریاست کی طرف سے کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی۔ کچھ ایسے اعمال بھی ہیں جنہیں ہماری صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے یعنی ہم چاہیں تو اُن کو کریں اور نہ چاہیں تو نہ کریں مطلب یہ ہے کہ اِن کو کرنے کی اجازت ہے۔ اسلئے اسلامی شریعت کے نقطۂ نظر سے معاملہ یہ ہے کہ یہ انسانی اعمال کو سامنے رکھ کر یہ بتاتا ہے کہ فلاں کام آدمی کو کرنا چاہیئے اور فلاں کام نہیں کرنا چاہیئے یعنی کچھ کام کرنا فرض ہے اور کچھ کام حرام ہیں۔ فرض ادا نہ کرنے پر سزا ہے اور حرام کام کرنے پر بھی سزا ہے۔ آدمی کیلئے کوئی کام کرنے کو پسند کیا گیا ہے مگر ایسے کاموں کے نہ کرنے پر کوئی سزا تجویز نہیں کی گئی، کچھ کام کرنے کو ناپسند کیا گیا ہے لیکن اُن کے کرنے پر کوئی سزا تجویز نہیں کی گئی۔ اس کے علاوہ کچھ کاموں کے بارے میں فیصلہ آدمی کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اِن کاموں کو کرے اور چاہے تو نہ کرے، یہ ہے انسانوں کے تعلق سے اسلامی شریعت کی حیثیت اور اسلئے کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کے تعلق سے اختیار اسلامی شریعت میں کسی بھی طرح زیرِ بحث نہیں آتا۔

تاہم انسانی اعمال کی فرض، حرام، مندوب، مکروہ اور مباح میں درجہ بندی کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شریعتِ اسلامی نے کچھ مخصوص اعمال کی فہرست بتائی ہے جو فرض ہیں، کچھ ایسے اعمال کی فہرست ہے جو حرام ہیں، تیسرے زمرے کے اعمال ہیں جن کو پسند کیا گیا ہے اور چوتھے زمرے کے اعمال کی فہرست جنہیں ناپسند کیا گیا ہے اور باقی اعمال کو مباح بتایا گیا ہے۔ بلکہ اسلامی شریعت نام ہے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے اوامر و نواہی کا جن کی عمومی معنوں کے ساتھ تشریح کی گئی ہے مثلاً

کسی چیز کی فروخت جو کسی مخصوص مقدار کیلئے محدود نہیں ہے یعنی کوئی بھی چیز بیچنا۔ اِن اوامر و نواہی سے پسند اور مرضی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ پسند کسی کام کے کرنے کے بارے میں یا تو قطعی اور فیصلہ کن ہوتی ہے یا غیر فیصلہ کن۔ کسی کام کے نہ کرنے کے بارے میں بھی فیصلہ کن یا غیر فیصلہ کن بات ہوتی ہے۔ یہ امر یا اختیار آدمی کے اعمال کیلئے حکم ہے۔ اس طرح شرعی حکم انسان کے اعمال کے تعلق سے شارع کا خطاب ہے۔ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کے معنی میں، یا کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کی اجازت کے تعلق سے حکم کی قسم شارع کی بات سے سمجھی جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی سے سمجھا جاتا ہے۔ اسلئے حکم کا مخاطب آدمی ہے اور اس حکم کا اطلاق آدمی کے اعمال پر ہوتا ہے۔ جس حکم سے آدمی کو خطاب کیا گیا ہے اس کا تعلق اس اجازت سے نہیں ہے کہ اسے کسی کام کو اپنی مرضی کے مطابق کرنے کی آزادی دی گئی ہے یا اس کی آزادی پر روک لگائی گئی ہے۔ اس کے بجائے یہ ہر اُس مسئلے کا حل ہے جس کا سامنا آدمی کو اپنی زندگی میں کرنا پڑتا ہے یعنی یہ آدمی کے ہر عمل کے بارے میں حکم کی وضاحت ہے جو آدمی بحیثیت انسان کے انجام دیتا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس کو سامنے رکھ کر احکام یا قوانین کے متن قرآن مجید اور حدیث شریف میں آتے ہیں۔ اس طرح احکام کی تمام آیات اور وہ احادیث جن میں احکام بیان ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اوامر و نواہی ہیں جو اس نے اپنے رسول اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کئے ہیں۔ یہ وحی اللہ تعالیٰ کے الفاظ اور معانی کے ساتھ قرآن کی شکل میں ہے یا اُسکے معانی بتائے گئے ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں بیان کیا

ہے جس کو حدیث کہتے ہیں۔ یہ اوامر ونواہی ہر اس مسئلے کا حل ہیں جو آدمی کو اپنی زندگی میں پیش آتا ہے یعنی اُن میں ہر عمل کیلئے ہر حکم کی وضاحت ہے جو آدمی سے بحیثیتِ انسان صادر ہوتے ہیں چاہے وہ حکم پابندی کے تعلق سے ہو یا اجازت کے تعلق سے۔ اس طرح کسی چیز کی اجازت ایک حکم ہے جس کے لئے دلیل ہونا ضروری ہے بالکل جس طرح کسی چیز کی ممانعت یا پابندی کیلئے۔

جب ایک شخص شارع کے خطاب یعنی اسکے اوامر ونواہی کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اِن کا تعلق بحیثیت انسان کے آدمی کے اعمال سے ہے جن میں عمومی بات کہی گئی ہے یعنی وہ اوامر ونواہی عمومی معنے کے ساتھ آئے ہیں جن کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو اُن کے تحت آتی ہے۔ مسائل کے حل کیلئے جو بات بھی کہی گئی ہو چاہے وہ حکم کی شکل میں ہو یا اسے مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہو، شارع نے اس حکم کو ایک کشادہ رہنما خطوط کی شکل میں بتایا ہے یعنی عمومی معنوں میں، جب کسی عمل کے بارے میں کوئی حکم آیا تو یہ حکم اس عمل کا زمرہ بھی عام تشریح کے ساتھ متعین کرتا ہے۔ یہ حکم شرعی کسی ایک عمل یا مجموعۂ اعمال تک محدود نہیں ہے، اسلئے اس کا اطلاق ہر اس عمل پر ہوگا جو اس زمرے یا قسم میں آتے ہوں اور ہر اس چیز پر بھی ہوگا جس کی عمومی تشریح میں نشاندہی کی گئی ہو۔ اگر تشریح میں علت (سبب) نہیں بتائی گئی ہو، تو جس چیز پر بھی عمومی تشریح کا اطلاق ہوتا ہو یا جو چیز بھی عمومی معنے کے تحت آتی ہو، اس پر بھی اس حکم کا اطلاق ہوگا، اس میں ہر وہ چیز شامل ہوگی جس پر حکم کی علت کا اطلاق ہوتا ہو۔ اس طرح بتایا گیا ہے کہ یہ

کسی چیز کی فروخت کے متعلق حکم ہے، یا فروخت کی اجازت کا حکم ہے یا یہ کسی چیز کے تبادلہ کا حکم ہے۔ شارع کے کلام میں بتادیا گیا:

﴿وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ﴾

"اللہ تعالیٰ نے فروخت کو حلال کیا ہے"۔ (سورہ بقرۃ: 2:275)

اور حدیث شریف میں بتادیا گیا:

(البَيعَان بِاَلخِيَارِ مَا لَم يَتَفرَّقَا)

"کسی چیز کی خرید و فروخت فریقین کی مرضی پر ہے جب تک کہ وہ جدا نہ ہو جائیں"۔

دوسری حدیث میں ارشاد ہے:

(بيعواُ الذَهَبَ وَ الفِضَّة كَيفَ شِئتُم يَدَاً بِيَد)

"چاندی کے بدلے میں سونا فروخت کر دو یا چاہو تو قیمتاً دیدو"۔

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے:

(وَ الذَهَبَ بِاَلذَهَبِ وَ الفِضَّةَ بِاَلفِضَّةِ يَدَاً بِيَد عَيناً بِعَين مِثلاً بِمِثل فَمَا زَادَ فَهُو رِبَا)

"سونے کے بدلے سونا، چاندی کے عوض چاندی، ہاتھ کی جگہ ہاتھ، پونجی کے بدلے پونجی اور چیز کے عوض چیز، جو کوئی اس سے زیادہ وصول کرے وہ سود ہے"۔

اسی طرح شارع اعظم کا فرمان ہے ”یہ حکم ہے فے کی تقسیم کا اور یہ حکم ہے مال کو صرف دولت مندوں کے درمیان گردش کرنے کا“۔ مویشی کی چراگاہ کیلئے بھی حکم ہے اور اس حکم سے عوامی استعمال کی چیزوں کیلئے حکم شرعی کا اشارہ ملتا ہے۔ وہ جو کسی کی ملکیت میں نہیں ہے جیسے معدنیات سے متعلق چیزیں وہ شہریوں کیلئے ریاست کی طرف سے عطیات کے زمرے میں آتی ہیں، ان کیلئے بھی شرعی حکم ہے۔ اس طرح فے کی تقسیم کے بارے میں بتایا گیا ہے جو انصار کو نہ دے کر صرف مہاجرین کو دی گئی تھی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كَيْ لاَ يَكُوْنَ دُوْلَةَ بَينَ الأغْنِيَاءِ مِنْكُمْ﴾

”تا کہ وہ تمہارے مال داروں کے درمیان ہی گردش نہ کرتا رہے“۔ (سورہ الحشر؛59:7)

حدیث پاک میں ارشاد ہے:

(النَاسُ شُرَكَاء فِي ثَلَاث، المَاء وأَلْكِلآ وَ النَار)

”لوگ تین چیزوں میں حصہ دار ہیں، پانی، چراگاہ اور آگ“۔

ایک اور حدیث میں عمر بن قیس سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر آپ کے پاس کوئی نمک کی کان ہو تو آپ اسے عطیہ میں دے سکتے ہیں۔ اُن سے کہا گیا ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ پانی میں سے ہے “یعنی یہ وہ چیز ہے جس کو پھر سے بھرا (Replenish) جا سکتا ہے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "فَلا اِذَن" یعنی

تب تم یہ نہیں لے سکتے۔ اس طرح متن کا اطلاق آدمی کے جدید اور متنوع اعمال پر ہوتا ہے۔ چاہے وہ کتنے ہی جدید کیوں نہ ہوں۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ کسی مسئلہ کا حل انہی عمومی معنوں سے نکالا جاتا ہے اور آدمی کے سامنے آنے والے ہر طرح کے مسئلہ کا حل اس میں ہوتا ہے۔ اس طرح ظہور پذیر ہونے والا کوئی بھی واقعہ حکم کا موضوع ہوتا ہے اور ایسی کوئی بات جس کا وقوع ہی نہ ہوا ہو وہ حکم کا موضوع نہیں ہوتا۔ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جو حقیقتاً پیش آئے جس کیلئے شرعی حکم نہ ہو۔ اس میں مفروضوں پر بحث نہیں کی جاتی۔ شارع نے متن کو اس شکل میں نازل کیا ہے اور بات کو انسانی دماغ پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنی حد تک پوری کوشش کر کے غور وخوض کے بعد ہر آنے والے مسئلے کے متعلق اس متن سے شرعی حکم معلوم کرے۔ یہی اجتہاد ہے۔ شارع کی نظر میں اجتہاد صرف مباح نہیں ہے بلکہ اس کو ہر زمانے کیلئے فرض کفایہ قرار دیا ہے۔ کسی بھی دَور میں اگر اجتہاد مفقود ہو گا یا جو زمانہ بھی مجتہدین سے خالی ہو گا، اس زمانے کے تمام مسلمان گناہ گار ٹھہریں گے۔

اسلامی شریعت اور مغربی قانون سازی کی یہ حقیقت ہے، دونوں میں بڑا زبردست فرق ہے۔ ایک قانون سازی جھوٹ اور گمان پر مبنی ہے جو مسائل کا غلط حل پیش کرتی ہے جبکہ دوسری قانون سازی سچی اور قطعی بنیاد پر ہے جو ہر مسئلہ کا صحیح حل بتاتی ہے بلکہ صحیح حل صرف یہی بتاتی ہے۔ تاہم اصل میں ہوا یہ کہ مغربی قانون سازی نے اسلامی شریعت کو بری طرح چیلنج کیا جس کے نتیجے میں مسلمان شکست خوردہ ہو گئے۔ اس شکست کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان سیاسی طور پر بھی

ناکام ہوئے اور ان کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ جب کوئی مغربی قانون سازی کو سمجھتا ہے تو وہ حیرت زدہ ہوتا ہے اور سخت تعجب میں پڑ جاتا ہے کہ اس میں انسانی مسائل کا کوئی حل ہی نہیں بتایا گیا ہے۔ اس کو اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ مغربی قوانین انسانی مسائل کو حل کرنے سے قاصر ہیں۔ اب اس کی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ اسلامی شریعت کتنی صحیح ہے اور یہ انسان کے سامنے آنے والے ہر مسئلے کو کتنے اچھے طریقے سے حل کرتی ہے۔ پھر بھی وہ مسلمانوں کو شکست خوردہ دیکھتا ہے، ایک سچے عقیدے کے حامل افراد جھوٹے عقیدے کے حامل افراد کے مقابلہ میں شکست کھا رہے ہیں۔

جب مسلمانوں پر مغربی قانون سازی کے ذریعہ حملہ کیا گیا، جس نے اسلامی نظام کو سرمایہ دارانہ نظام سے چیلنج کیا، تو وہ مغرب میں واقع ہونے والے عظیم صنعتی انقلاب سے دھوکے میں آگئے۔ ان کو اس چیلنج کا جواب دینے کیلئے کہا گیا، مغرب کے لوگوں نے ایک غلط بنیاد ان کے سامنے رکھی کہ مغربی نظام ان مسائل کو بحسن و خوبی حل کر سکتا ہے جبکہ اسلام کے پاس ان مسائل کا کوئی ایسا حل نہیں ہے۔ مسلمانوں نے اپنے ذہنوں میں مسائل کے سرمایہ دارانہ حل کو ایجادات اور صنعتوں کی عظمت سے جوڑ دیا اور انہوں نے اس مسئلے کا حل اسلام میں بھی اسی طریقے سے تلاش کیا جس طرح مغربی قانون سازوں نے کیا تھا۔ ان کی سوچ اور مطالعے میں یہ نقص رہا۔ یہ وجہ تھی جس نے اسلامی احکام پر مسلمانوں کے اعتماد کو متزلزل کر دیا، جس کے حل مغربی احکام اور قانون سازی سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔

دراصل اسلامی شریعت اللہ سبحانہ و تعالیٰ، اس کے رسولوں، کتابوں، فرشتوں اور یوم جزا پر ایمان سے بر آمد ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ قرآن اور سنت سے صادر ہوتی ہے جن کے بارے میں قطعی طور پر ثابت ہو چکا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعہ آئے ہیں۔ جو کچھ بھی قرآن اور سنت سے اجمالی ادلہ، قواعدِ عامہ، تعریفِ شرعیہ، احکام کلیہ یا جزوی احکام کی اصطلاحات میں معلوم ہوتا ہے، ان سب سے اسلامی شریعت بنتی ہے۔ کسی بھی طرح کے پیش آمدہ حالات کو اسلامی شریعت کے ان مشمولات کے سامنے رکھا جاتا ہے اور اُن میں سے ان کے احکام نکالے جاتے ہیں۔ جہاں تک ان نئے مسائل کا سوال ہے خاص طور سے وہ جو سرمایہ دارانہ معاشرے کے علاوہ اور کہیں نہیں پائے جاتے، ان کو سامنے رکھ کر یہ کہہ کر اسلام پر حملہ کیا گیا کہ ان مسائل کا حل اسلام کے پاس نہیں ہے، یہاں مسئلے کی حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے نہ کہ اس متعین حکم کو۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد ہی شریعت کا متن، اس کے اصول، تعریفیں اور احکام کو اس حقیقت پر منطبق کیا جاتا ہے، اس کے بعد ہی اس کے متعلق اسلامی رائے معلوم کی جاتی ہے۔ جہاں تک کسی متعین حکم کی بات ہے اس پر سوال نہیں کیا جاتا کہ یہ صحیح ہے یا غلط، یہ نہیں دریافت کیا جاتا کہ جو کچھ سرمایہ دار کمپنی کے حصص، بیمہ، غیر ملکی تجارت اور بینک وغیرہ کے بارے میں کہتے ہیں اس سے اسلامی شریعت اتفاق کرتی ہے یا نہیں، بلکہ معلوم یہ کیا جاتا ہے کہ ان معاملات کے تعلق سے شرعی نقطۂ نظر کیا ہے۔ اگر ہر نئے پیش آمدہ مسئلے کے بارے میں شریعت اپنی رائے دیتی ہے تو یہ شریعت مکمل ہے قطع نظر اس سے کہ یہ سرمایہ دارانہ رائے سے

مطابقت رکھتی ہے یا نہیں۔ تاہم مسلمانوں نے مغربی قانون سازی کی غلطیوں کو اجاگر نہیں کیا، ان کی نظر براہ راست نظام سرمایہ داری کی خامیوں پر جانا چاہئے تھی۔ اس کے بجائے مسلمانوں کے ذہنوں نے اپنے مسائل کو مغرب کی ایجادات اور صنعتوں کی عظمت سے جوڑ کر دیکھا۔ اسی طرح وہ اس کی وضاحت نہیں کر پائے کہ دراصل معاملہ مسئلہ کی حقیقت پر اسلامی حکم معلوم کرنے کا تھا نہ کہ اسلام کو مغربی قانون سازی کے مطابق چلانے کا۔ اس طرح وہ اسلام میں سے ایسی رائے کی تلاش میں لگ گئے جو مغربی نظام کے مطابق ہو یا کم از کم اس سے ٹکراتی نہ ہو تاکہ وہ یہ ثابت کریں کہ اسلام ہر دور کیلئے مناسب ہے۔ اس سوچ کی وجہ سے زبردست نقصان ہوا۔ مثلاً جب مسلمانوں سے مشترکہ کمپنیوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہیں یہ نہیں سوچنا چاہئے تھا کہ آیا اسلام اس کے بارے میں وہی رائے رکھتا ہے جو مشترکہ کمپنیوں کے بارے میں سرمایہ دارانہ نظام کی رائے ہے، زمانے کا ساتھ دینے کیلئے ایک بیکار کوشش کی گئی۔ ایسا کرنے کے بجائے مسلمانوں کو یہ دریافت کرنا چاہئے تھا کہ مشترکہ کمپنیوں کے تعلق سے اسلام کی رائے کیا ہے۔ اس حالت میں جواب یہ ہوتا کہ مشترکہ کمپنی میں مسئلے کی حقیقت یہ ہے کہ کمپنی ایسے حصہ داروں (Partners) نے بنائی ہے جن سے عوام ناواقف ہیں۔ مشترکہ کمپنی کو قائم کرنے والے وہ تمام لوگ ہیں جنہوں نے کمپنی کے ابتدائی معاہدے پر دستخط کئے تھے۔ مجوزہ کمپنی میں برائے نام قیمت کے حصص (Shares) کے ذریعہ چندہ جمع کیا جاتا ہے۔ مشترکہ کمپنی کا معاہدہ دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقے پر ہوتا ہے۔ پہلے طریقے میں کمپنی کے حصص صرف ان لوگوں کو دیئے

جاتے ہیں جنہوں نے کمپنی کی بنیاد رکھی تھی، یہ لوگ عوام میں حصص فروخت کرنے کے بجائے آپس میں ہی انہیں تقسیم کر لیتے ہیں۔ کمپنی میں دستوری ڈھانچے (Articles of Association) پر دستخط کرتے وقت ہی یہ شرائط طے کرلی جاتی ہیں اور اسی کے مطابق کمپنی کام کرتی ہے۔ وہ تمام لوگ جو اس دستور پر دستخط کرتے ہیں وہ اس کمپنی کے قائم کرنے والے اور حصہ دار مانے جاتے (Partner) ہیں، ایک مرتبہ جب یہ سب دستخط کر دیتے ہیں کمپنی قائم ہو جاتی ہے۔ دوسرا طریقہ چندہ کرنے کا یہ ہے کہ کچھ لوگ مل کر ایک کمپنی قائم کر لیتے ہیں اور کمپنی کی شرائط کے ساتھ اس کا دستور تیار کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد کمپنی کے حصص عوام میں فروخت کرکے چندہ جمع کیا جاتا ہے۔ چندے کی مدت پوری ہونے کے بعد، کمپنی قائم کرنے والے آپس میں مل کر کمپنی کو چلانے کیلئے ایک بورڈ تشکیل دیتے ہیں، اس طرح کمپنی اپنا کام شروع کر دیتی ہے۔ یہ کمپنی یعنی مشترکہ اسٹاک کمپنی (Joint Stock Company) سرمایہ دارانہ نظام میں ایک پارٹی کا کام سمجھا جاتا ہے یعنی فرد واحد کا کام نہ کہ دو لوگوں کا کام۔ اس کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ یہ تنہا ایک کی مرضی سے کام ہوتا ہے، اس سے وضاحت ہو جاتی ہے کہ سرمایہ دار کیوں کہتے ہیں کہ شیئر اسٹاک کمپنی کی تشکیل تنہا ایک شخص کی مرضی کا کام ہے۔ عام طور پر یہ بات مانی جاتی ہے کہ معاہدے میں فریقین کی رضامندی شامل ہوتی ہے اور کچھ مخصوص معاملے جیسے فروخت اور پٹہ (Lease) وغیرہ معاہدے کے زمرے میں آتے ہیں۔ معاہدے کے علاوہ ایک چیز اور ہے جسے خواہش فرد واحد (Solitary Will) کہتے ہیں، یہ ایک مخصوص وعدہ

(Commitment) ہوتا ہے جو کسی فرد کے ذریعہ کیا جاتا ہے، جیسے شیئر اسٹاک کمپنی کی تشکیل، کوآپریٹیو اور وصیت شیئر اسٹاک کمپنی کا حصہ دار (Partner) اپنی طرف سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ حصص (Shares) کی ایک مخصوص مقدار قیمت ادا کرکے خریدے گا، قطع نظر اس کے کہ دوسرے حصہ دار اسے قبول کرتے ہیں یا رد کرتے ہیں اور قطع نظر اس کے کہ وہ اس پر خوش ہوتے ہیں یا ناراض۔ جو بھی ایک بار معاہدے پر دستخط کردے یا حصص خرید لے، وہ اس کمپنی کا حصہ دار بن جاتا ہے۔ اس طرح اس شیئر اسٹاک کمپنی کے حصص فروخت کیلئے رکھے جاتے ہیں اور کرنسی، بینک نوٹس کی طرح بازار میں گردش (Circulation) کے لئے لائے جاتے ہیں۔ اس طرح خریدار جب ایک مرتبہ حصص کی قیمت ادا کر دیتا ہے تو وہ کمپنی میں حصہ دار بن جاتا ہے۔ مغربی سرمایہ دار شیئر اسٹاک کمپنی کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ "یہ دو لوگوں کے درمیان معاہدہ ہے جس میں دونوں اقتصادی یا مالی پروجیکٹ (منصوبہ) میں حصہ لینے پر راضی ہوتے ہیں تاکہ جو بھی نقصان اس سے ہو وہ اسے باہم تقسیم کرلیں"۔ یہ حقیقت ہے شیئر اسٹاک کمپنی کی۔ اگر شریعت اسلام کی روشنی میں اس قسم کی کمپنی کو پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک ناجائز کمپنی ہے اور اس میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی ناجائز خرید و فروخت حرام ہے۔ اس کا ناجائز ہونا اس حقیقت پر مبنی ہے کہ شریعت اسلامی نے کمپنی کی حقیقت کا تعین کر دیا، اسکے ڈھانچے اور اصولوں کو بھی بتا دیا۔ اسلام میں کمپنی کی تعریف یہ ہے کہ "دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان معاہدہ جو منافع کے مقصد سے کسی منصوبے پر کام کرنے کو راضی ہوں"۔ قانونی

طور پر یہ ایک ایسا کام ہے جو دو لوگوں کے درمیان عمل میں آتا ہے نہ کہ کوئی ایسا کام جس کا آغاز صرف ایک فرد واحد سے ہوتا ہے۔ اس طرح کمپنی ایک معاہدے کے بعد تشکیل پاتی ہے، اس کمپنی کی قسم اور طرز کیسی ہی ہو اسلام میں معاہدے کے لئے بیک وقت تجویز(Offer) اور قبولیت کا ہونا لازمی ہے۔ معاہدے کیلئے دو فریقوں'(Parties) کا ہونا ضروری ہے۔ ایک فریق (Party) پیشکش(Offer) کی ذمہ داری لیتا ہے یعنی وہ پیشکش کرتا ہے، مثلاً ”میں نے تم کو شادی میں دیا......“ یا ”میں نے تم کو فروخت کیا......“ یا ”میں تم کو ملازمت کی پیشکش کرتا ہوں......“ یا ”میں تمہارے ساتھ حصہ لیتا ہوں......“ وغیرہ وغیرہ۔ دوسرا فریق یہ کہہ کر پیشکش قبول کرتا ہے کہ ”مجھے یہ منظور ہے......“ یا ”میں اس پر راضی ہوں......“ وغیرہ۔ اگر معاہدے میں دونوں فریق شامل نہیں ہیں یا جس میں پیشکش اور اسے قبول کرنے کا ذکر نہیں ہے تو شرعی طور پر ایسے معاہدے کا انعقاد ہی نہیں ہوا اور ایسا معاہدہ باطل ہے۔ شریعت میں فروخت کے معاہدے اور کمپنی کے ڈھانچے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ مغربی قانون سازی میں شیئر اسٹاک کمپنی کی تشکیل(Set up) ایک ایسا کام مانا جاتا ہے جس کا تعلق فرد واحد کی مرضی( Solitary Will) سے ہے نہ کہ یہ فروخت کے معاہدے کی طرح ہے، کیونکہ اس میں دو فریق نہیں ہیں، بلکہ اس میں کمپنی ایک فریق یا گروپ پر مشتمل ہوتی ہے جس نے اپنے آپ کو کسی چیز کا پابند کیا ہوتا ہے لیکن دوسرے فریق یا گروپ کے ساتھ اسکی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ شریعت اسلامی میں کمپنی ڈھانچے کو فروخت کے معاہدے کی طرح مانا جاتا ہے یا پٹے کے معاہدے کی طرح یا وکالت

کی طرح وغیرہ وغیرہ۔ یہ وقف، وصیت، ترغیبی پیشکش اور عطیات دینے جیسا نہیں مانا جاتا اسلئے شیئر اسٹاک کمپنی شرعاً ناجائز ہے جس کی اسلام میں کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اس معاملے میں سوال کی حقیقت کو شرعی تعریف پر منطبق کیا اس بنیاد پر اس کی رائے لی گئی اور اس معاملے میں اسلام کا فیصلہ معلوم ہوا۔ شرعی تعریف (Definition) یقیناً شرعی مصادر سے لی گئی۔ کمپنی کی قسم (Nature) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین کر دیا ہے، اس کے دو فریق (Partners) ہوتے ہیں، اس کا انعقاد پیشکش اور قبولیت کے بعد ہی ہوتا ہے۔ البراءہ بن العازب اور زید بن ارقم دو حصہ دار تھے، انہوں نے کچھ نقد اور کچھ ادھار چاندی خریدی یہ خبر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچی تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا:

(اِنْ مَا كَان بِنَفَد فَاَجِيزُوهُ وَمَا كَان نَسِيئة فَرُدُوه)

''وہ حصہ جو نقد تھا اسکی اجازت ہے جو حصہ قرض تھا اس کو واپس کر دو''۔

حدیث قدسی میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:

(اَنَا ثالث الشريكين ما لم يخن احدهما صاحبه، فَاِذا خانه خرجت من بينهما)

''میں دو حصہ داروں میں تیسرا ہوں (ساتھ ہوں) جب تک کہ دونوں ساتھیوں میں سے کوئی دوسرے ساتھی کو دھوکہ نہیں دیتا، اگر ان میں سے ایک ساتھی دوسرے کو دھوکہ دیتا ہے تو میں اُن کے درمیان سے ہٹ جاتا ہوں''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:

(الربح على ما شرط العاقدان و الوضيعة على قدر المال)
”منافع معاہدہ کرنے والوں کے درمیان طے شدہ شرائط کے مطابق ہوتا ہے اور خسارہ پونجی کی مقدار کے مطابق“۔

یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمار بن یاسر اور سعد ابن ابی وقاص کے ساتھ ایک متحدہ کمپنی بنائی تھی۔ ان تمام مثالوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام میں معاہدہ دو لوگوں کے درمیان ہی منعقد ہوتا ہے نہ کہ کسی ایک شخص کے کچھ کرنے سے، اس طرح اسلام میں کمپنی کی تعریف متعین کر دی گئی۔ یہ ہے اسلام کی رائے شیئر اسٹاک کمپنی کے تعلق سے۔ اس سے قطع نظر کہ یہ رائے سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے میل کھاتی ہے یا نہیں، اس کے اوپر ہی عمل ہو گا۔ جعل سازی کر کے دوسری رائے اختیار کرنا حرام ہے اور یہ اسلام کے خلاف ہے اور اسلام کے علاوہ کسی اور کی ہدایت پر عمل کرنا بھی حرام ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شیئر اسٹاک کمپنی کے تعلق سے اسلامی نقطۂ نظر تسلیم کیا جائے نہ کہ اس معاملے کے تعلق سے سرمایہ دارانہ رائے کے مطابق اسلام کو ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔

جب مسلمانوں سے بیمہ کے بارے میں دریافت کیا جاتا ہے تو انہیں یہ طے کرنے میں جھجھکنا نہیں چاہئے اور اس طرح نہیں سوچنا چاہئے کہ جو کچھ سرمایہ دار بیمہ کے تعلق سے رائے رکھتے ہیں،

اسلام اس کو مانتا ہے یا نہیں تا کہ وہ یہ بتا سکیں کہ اسلام وقت کے ساتھ چلنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ بلکہ سوال اس طرح ہونا چاہئے کہ بیمہ کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہو گا کہ بیمہ کا معاملہ یہ ہے کہ یہ ایک تحفظ یا ضمانت ہے جو بیمہ کمپنی کی طرف سے اس شخص کو دی جاتی ہے جو کسی چیز کا بیمہ کراتا ہے۔ اگر بیمہ شدہ چیز کھو جاتی ہے یا تباہ ہو جاتی ہے تو بیمہ کمپنی اس گمشدہ یا تباہ شدہ چیز کا متبادل یا اس کے بقدر قیمت کی پیشکش کرتی ہے۔ اس طرح بیمہ ایک ضمانت ہے اور اسلام میں ضمانت کے جو اصول ہیں یہاں ان کا اطلاق ہو گا۔ اس کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے ہوتی ہے:

(كُنَّا مَع النَبِی فِی جَنَازة فَلَمَّا وَضَعَت قال: هل على صاحبكم من دين قالوا نعم درهمان فقال: صلوا على صاحبكم۰ فقال علي: هُمَا عليَّ يا رسول الله اَنَا لَهُمَا ضَامِن۰ ’ فَقَامَ رَسُول الله ثُم اَقبَلَ على علیٍ فَقَال: جَزَاک الله خَيراً عَن الاِسلام و فَک رِهَانَک كَما فَکَکتَ رِهَان اَخِيکَ)

”ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا ہم ایک جنازے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھے۔ جب جنازے کو دفنانے کیلئے رکھا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ کیا تمہارے بھائی کے اوپر کوئی قرض ہے؟ ہم نے جواب دیا جی ہاں! دو درہم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم اپنے ساتھی کی نماز پڑھ لو" اس پر حضرت علی نے کہا اس کی ضمانت میں لیتا ہوں میں اسے ادا کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر کھڑے ہو گئے اور حضرت

علی کے پاس جا کر فرمایا" اس نیک کام کا اللہ تمہیں اجر دے اور تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے جس طرح تم نے اپنے بھائی کی ضمانت دی ہے"۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ضمانت ایک وعدہ ہے جس کا تعلق ایک دوسرے وعدے پر عمل کرنے سے ہے یعنی حضرت علی نے جو ذمہ داری ادا کرنے کا وعدہ کیا وہ اس وعدے سے جڑا تھا جو مقروض نے کیا تھا۔ اس سے قرض کی ضمانت کا بھی ثبوت ملتا ہے، یہ اس کی ذمہ داری ہے جس نے قرض لیا ہے۔ اس سے ضمانت اور ضامن کی بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے یعنی مقروض کو چاہئے کہ وہ قرض خواہ کو اس بات کی ضمانت فراہم کرے وہ قرض ادا کر دے گا۔ حدیث سے یہ بات بھی صاف ہے کہ ضمانت معاوضہ نہیں ہے، اس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ شریعت کی رو سے ضمانت کی تعریف یہ ہے یعنی "جس چیز کی ضمانت دی گئی ہو اس کی ذمہ داری کو بغیر کسی تلافی یا معاوضے کے حق کی ادائیگی سے جوڑنا" دوسرے الفاظ میں بغیر کسی معاوضے کے کسی چیز کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لینا۔ ان تمام چیزوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیمہ کے تعلق سے شرعی حکم یہ ہے کہ یہ حرام ہے اور اس کی اجازت بالکل نہیں ہے، کیونکہ یہ ایک ذمہ داری کو دوسری ذمہ داری سے جوڑنے کے متعلق نہیں ہے، اس کے علاوہ بیمہ کمپنی نے کسی کو بھی اس ذمہ داری سے جوڑا نہیں، نہ یہاں کسی قسم کا مالی حق اس کو دیا جاتا ہے جس کی ضمانت دی گئی ہو جس کا کہ بیمہ کسی سے بھی وعدہ کرتی ہے، اس معاہدے کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی اور اس کا معاوضہ پریمیم (Premium) کی شکل میں کمپنی کو دیا جاتا ہے۔ ضمانت کے تعلق سے ان تمام

شرائط کو مد نظر رکھتے ہوئے جو شریعت نے عائد کی ہیں، بیمہ کا معاہدہ غلط ہے اور اسی لئے باطل ہے۔ تمام باطل سودے اور معاملات حرام ہیں اور بیمہ کا معاملہ بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ یہ بیمہ کے تعلق سے شرعی نقطۂ نظر ہے قطع نظر اس سے کہ سرمایہ داروں کو اس سے اتفاق ہے یا نہیں۔ اس حقیقت کا کہ شریعت ہر زمانے کے مسائل کو حل کرنے کی اہلیت رکھتی ہے یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ یہ زمانے کے موجودہ نظام کے مطابق مسائل کو حل کرتی ہے۔ بلکہ شریعت ایسے مسائل کے بارے میں اپنی رائے دیتی ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ زمانے کا موجودہ نظام اس کے بارے میں کیا کہتا ہے۔

ایک اور مثال دوسری ریاستوں سے تجارت کی ہے مسلمانوں سے یہ دریافت کرنا صحیح نہیں ہے کہ غیر ملکی تجارت میں تبادلِ اشیاء کی آزادی کے اصول، تحفظات کا اصول، قومی معیشت یا خود کفالت کی پالیسی کو اسلام تسلیم کرتا ہے یا نہیں؟ بلکہ سوال یہ ہونا چاہئے کہ تجارتی تعلقات کے سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ أَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ﴾

"اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے"۔ (سورہ بقرۃ: 2:275)

﴿إلاَّ أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ﴾

"یہ اور بات ہے کہ تمہاری آپس کی رضامندی سے کوئی سودا ہے"۔ (سورہ النساء: 4:29)

﴿إلاَّ أنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ﴾

”مگر یہ کہ کوئی سودا دست بدست ہو جس کا لین دین تم آپس میں کر رہے ہو“۔ (سورہ بقرۃ؛2:282)

اس طرح اسلام خرید و فروخت اور تجارت کی اجازت دیتا ہے۔ اس متن میں عام الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اب یہ تجارت اسلامی ریاست کی حدود کے اندر ہو یا اس سے باہر۔ اس میں ہر وہ شخص شامل ہے جو اسلامی ریاست کا شہری ہے چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ تاہم وہ جس کے پاس اسلامی ریاست کی شہریت نہیں ہے، دشمن تصور کیا جائیگا جیسے مسلمان اور اسرائیل کے درمیان حالتِ جنگ ہے یا ایسی حالت میں بھی دشمن ہی تصور کیا جائے گا جہاں جنگ نہ ہو جیسے مسلمان اور دوسری ریاست مثلاً جرمنی۔ اگر اسلامی ریاست اور اس ملک کے درمیان جہاں کا وہ شہری ہے، کوئی ایسا معاہدہ نہیں ہے تو ایک انفرادی شخص دشمن ہی تصور کیا جائے گا اور اسے اسلامی ریاست میں داخلے کی اجازت نہیں دی جائے گی جب تک کہ وہ ریاست میں داخل ہونے کیلئے ہر مرتبہ مخصوص اجازت نامہ حاصل نہ کرلے۔ اگر دونوں ملکوں کے درمیان کوئی معاہدہ موجود ہے تو اس معاہدے کی شرائط کے مطابق اسے اسلامی ریاست میں داخلے کی اجازت ہوگی۔ ایک دشمن شخص کیلئے جو اصول ہوگا وہ اس شخص کے ساتھ اس کی پونجی پر بھی اس اصول کا اطلاق ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلامی ریاست کے شہریوں کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ بغیر کسی رکاوٹ کے غیر ملکوں سے تجارت کرسکتے ہیں سوائے اُن چیزوں کی تجارت کے جن سے ریاست کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ جہاں تک دوسری ریاست کے شہریوں کا تعلق ہے تو اسلامی

ریاست کو اس کا حق ہے کہ اگر وہ ضروری سمجھے تو ان پر کچھ پابندیاں عائد کرے چاہے اس کے ملک سے معاہدہ ہو یا نہ ہو، یہ پابندیاں دشمن لوگوں پر حالتِ جنگ کے اصولوں کے مطابق ہی لگائی جائیں گی۔ یہ سوال نہیں کیا جانا چاہیئے کہ یہ رائے کسی مخصوص زمانے کے موجودہ قانون سے مطابقت رکھتی ہے یا نہیں بلکہ پوچھا صرف یہ جانا چاہیئے کہ اسلام کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے اور اس کے پیچھے دلیل کیا ہے ؟

اب بینکوں کی مثال لیں۔ یہاں بھی مسلمانوں سے یہ پوچھنا صحیح نہیں ہے کہ کیا بینکوں (Banks) اور ان کے نظم کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر بھی وہی ہے جو سرمایہ داروں کا ہے اور کیا اسلام بھی سود اور سود خوری کی اجازت دیتا ہے ؟ مسلمانوں سے تو یہ دریافت کیا جانا چاہیئے کہ بینکوں کے بارے میں اسلام کیا رائے دیتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہوا کہ موجودہ بینکوں کے نظام کی حقیقت یہ ہے کہ ان کی بنیاد سود خوری پر ہے، یہ قلیل مدتی (Short term) اور طویل مدتی (Long term) قرضہ مہیا کراتی ہیں، اس کے کرنٹ کھاتے اور مختلف چیزوں کیلئے قرضے کی سہولیات بھی دیتی ہیں۔ جہاں تک سرمایہ کی منتقلی، پیسے کو جمع کرنے یا اس کے تحفظ کی بات ہے تو اجرت لے کر یا بغیر اجرت کے دونوں طرح اس کی اجازت ہے۔ اب رہی بات سود خوری کے متعلق لین دین کی، یہ یقیناً حرام ہے۔ اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ حَرَّمَ الرِّبَا﴾

"اللہ نے سود خوری کو حرام کیا ہے"۔ (سورہ بقرۃ: 2:275)

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ بھی فرمایا:

﴿فَلَكُمْ رؤُسُ أمْوَالِكُمْ﴾

"تو اپنا اصل مال لینے کا تمہیں حق ہے"۔(سورہ بقرۃ:2:279)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

( اِنما الربا في النسيئة)

"یقیناً ادائیگی میں دیر کرنا سود خوری ہے"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:

( وَ الذَهب بالذهب و الفِضةَ بالفِضةِ يَدا بِيَد عَيناً بِعَين مِثلاً بِمِثل فَمَا زَادَ فَهُوَا رِبَا)

"سونے کے بدلے سونا، چاندی کے عوض چاندی، نقد کے بدلے نقد، پونجی کے عوض پونجی اس طرح جو چیز ہو اس کے بدلے وہی۔ اس سے زائد جو کچھ ہے وہ سود ہے"۔

الربا(سود) کی اصطلاح قرآن و حدیث میں عام شکل میں آئی ہے اسلئے اس میں سود کی ہر شکل شامل ہے، یہ ایک عام نام ہے جو دو حروف الف اور لام سے مل کر بنا ہے یعنی اس میں سود خوری کی تمام شکلیں شامل ہیں چاہے وہ اصل اور واپس کی گئی رقم میں فرق ہو (رباء الفضل) یا ادائیگی میں تاخیر (رباء النسیئۃ) کی شکل میں، چاہے یہ وہ سود ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں معروف تھا یا سود کی وہ شکل ہو جو معروف نہیں ہو اسلئے وہ نیا معاملہ ہو۔ اس کیلئے کہیں سے گنجائش

نہیں ہے کہ سود کی کسی بھی شکل کو حلال قرار دیا جائے کیونکہ اس کا حرام ہونا عام ہے۔ عام اصطلاح عام ہی رہے گی جب تک کہ اس کو محدود کرنے کی یا اس کی تخصیص کی کوئی دلیل نہ ہو۔ اس معاملے میں اس کے مخصوص کرنے کی کوئی دلیل نہیں پائی جاتی، اسلئے ربا (سود) عام معنوں میں ہی سمجھا جائے گا اس طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے الفاظ ”تم اپنی اصل پونجی لوگے“ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ (فما زاد فھو ربا) یعنی "جو کچھ بھی زیادہ لوگے وہ سود ہے“۔ یہ اس معاملے میں واضح ہیں کہ پونجی کی حاصل جمع (Sum) میں کسی بھی قسم کا اضافہ حرام ہے چاہے اس اضافہ کی کیفیت جو بھی ہو، اسی لئے سود حرام ہے۔ سود کے تعلق سے اسلام کی یہ رائے ہے قطع نظر اس سے کہ سرمایہ دار اس سے اتفاق کرتے ہیں یا نہیں، یا موجودہ زمانے میں لوگوں کا نقطۂ نظر کیا ہے یا معاشرے میں لوگوں کو فائدہ کس چیز میں نظر آرہا ہے۔ ایک مرتبہ سود کا حرام ہونا ثابت ہونے کے بعد یہ تمام سوالات غیر متعلق ہیں، اسلامی شریعت نہایت موزوں اور قابلِ عمل ہے۔ اس حقیقت سے آپ اسلئے منع نہیں کرسکتے کہ اس میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ سود کی اجازت دے تاکہ ہم وقت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے زمانے کے ساتھ ”ترقی“ کر سکیں، اس طرح لوگوں کی مصلحت کا بھی خیال رکھ سکیں اور مالی حالت کو بھی قابو میں رکھ سکیں۔ بلکہ یہ موزوں اسلئے ہے کہ یہ معاشرے یا لوگوں کے ہر مسئلے کو حل کرنے کا اس کا اپنا ایک طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ سود اُن معاملات میں سے ہے جو سرمایہ دارانہ معاشرے کیلئے مخصوص ہیں، کمیونسٹ یا اسلامی معاشرے میں اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اسلئے جب سود کے تعلق سے

کمیونزم یا اسلام کی رائے لی جاتی ہے تو یہ اصل معاملے کے تعلق سے رائے ہوتی ہے جس کی فی الواقع ضرورت ہے نہ کہ یہ بات کہ کمیونزم یا اسلام کی رائے سرمایہ دارانہ رائے کے مطابق ہے یا نہیں۔

یہ کچھ معاملات تھے جن کے تعلق سے سرمایہ دارانہ نظام اسلامی نظام پر حملہ آور ہوا اس دعوے کے ساتھ کہ اسلام زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتا اور یہ زمانے کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ مسلمانوں نے اس کا جواب اس طرح نہیں دیا کہ وہ تفصیلی دلائل کی روشنی میں مسئلے کی اچھی طرح وضاحت کرتے بلکہ انہوں نے اسلام سے ایسا حل نکالنے کی کوشش کی جو سرمایہ دارانہ نظریہ کے بتائے ہوئے نمونہ کے مطابق ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں ایسا کوئی حل نہیں مل سکتا کیونکہ اسلام اور سرمایہ داری کے عقائد میں ہی بنیادی اختلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے جب اسلام کی ترجمانی اس طرح کی کہ اس میں سرمایہ دارانہ نظام سے مطابقت پیدا کریں تو وہ بری طرح شکست کھا گئے۔ یہ سوچ عام ہو گئی اور مسلمانوں کی اس سوچ سے بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ اس طرح بہت سے غلط تصورات مسلمانوں میں پیدا ہو گئے جیسے "اسلام میں لچک ہے اور اس میں قبول کرنے کی صلاحیت ہے"، "اسلام کو زمانے کے ساتھ چلنا چاہئے"، "یہ ضروری ہے کہ اسلام اور جدید دنیا میں ہم آہنگی پیدا کی جائے" اس طرح کی اور باتیں۔ اس طرح کے تصورات پیدا کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اسلام کی ایسی ترجمانی کی جا سکتی ہے جو لوگوں کے موجودہ نظریات کے مطابق ہو چاہے وہ اسلام کی بنیادی تعلیم اور اقدار سے کتنی ہی متضاد ہو۔ یہ

ہے مطلب اسلام کو زمانے سے ہم آہنگ کرنے اور زمانے کا ساتھ دینے کا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کفار کی دی ہوئی ہدایات کے خلاف چلنا غلط ہے۔ ایسا اس لئے ہے کیونکہ جدید دنیا میں کفار کو برتری حاصل ہے اور مسلمان اسلام کی ترجمانی اس طرح کریں کہ وہ کفار کے حسبِ حال ہو جائے اور اسلام اور جدید دنیا میں ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ اس طرح کے غلط تصورات کو اختیار کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کو چھوڑ کر سرمایہ داری کا اتباع کیا جائے کیونکہ اسلام تو سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے سراسر خلاف ہے، اسلئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ان دونوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ اسلئے اس طرح کی کوئی بھی بات جو اسلام اور سرمایہ داری میں مطابقت یا ہم آہنگی پیدا کرنے والی ہو اسلام سے دست برداری اور کفر کو قبول کرنے کے مترادف ہو گی۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام عام اصولوں اور کشادہ رہنما خطوط کے ساتھ آیا ہے اور انسانی دماغ پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ ان بنیادوں سے شرعی احکام کا استنباط کرے تاکہ معاشرے میں روز مرہ پیش آنے والے مسائل کو حل کر سکے۔ تاہم اس سے ایسی کسی ''ترقی'' یا ''لچک'' کی نشاندہی نہیں ہوتی کہ کوئی بھی شخص اپنی پسند کے مطابق کوئی بھی اصول اس سے نکال لے۔ یہ اصول اور رہنما خطوط الفاظ اور معانی کے لحاظ سے وہ حدود بتاتے ہیں جن کے اندر رہ کر شرعی حکم کو معلوم کیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ اصول معنوں اور احکام کو بتائیں گے اس حالت میں جب کہ کوئی مسئلہ پیش آئے جس کو حل کرنے کی ضرورت ہو۔ ان اصولوں اور رہنما خطوط کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام کسی بھی وقت یا زمانے کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ ان اصولوں اور رہنما خطوط سے ان کے نقطۂ

نظر کے مطابق کسی بھی دور اور وقت کے مسائل کا حل نکالا جا سکتا ہے، ان سے جو بھی معنے نکلتے ہوں حل اسی کی روشنی میں ہو گا نہ کہ اس زمانے اور وقت کے لوگوں کے نقطۂ نظر کے مطابق۔ جہاں تک اسلام اور جدید دنیا میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی بات ہے تو اس کا مطلب اسلام کی دعوت کو ترک کرنا اور کافرانہ افکار کی دعوت دینا ہے اور مسلمانوں کو اس کی دعوت دینا ہے کہ وہ ان افکار کو قبول کر لیں۔ یہاں جدید دنیا سے مطلب، اس کی صنعت، ایجادات، انکشافات اور سائنسی علوم سے نہیں ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ یہ عوامل دنیا میں ٹکراؤ کا موضوع نہیں ہیں اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ ان معاملات میں اور اسلام میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ بلکہ اسلام اور جدید دنیا میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی بات عقیدے اور نظامِ زندگی کے بارے میں ہے جو موجودہ زمانے میں رائج ہے۔ مسلمانوں کیلئے اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ مغربی طرزِ زندگی کے مطابق رہیں اور اُن مسائل کو جو معاشرے میں نقصان پہنچا رہے ہیں، سرمایہ دارانہ نظام کے ذریعہ حل کریں۔ یہ ہے جدید دنیا کی تصویر جو مغربی کفار اور مسلمانوں کے درمیان ٹکراؤ کے نتیجے میں ابھر کر آئی ہے۔ یہاں جدید دنیا کا مطلب ہے سرمایہ داری جس میں جمہوریت، دیوانی قانون اور اس طرح کی چیزیں شامل ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ سب کفر ہے، اس پر حملہ کر کے اسے ختم کرنا چاہیئے تاکہ اسلامی حکومت قائم ہو اور اسلامی نظام کو آج کی دنیا کے انسانی مسائل کو حل کرنے کیلئے مرجع بنایا جائے۔ بحیثیت مسلمان کے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم کس طرح مغربی عقیدے کو ہٹا کر اس کی جگہ اسلامی عقیدہ لائیں۔ اس طرح یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان اپنے اور کفر کے درمیان

ہم آہنگی پیدا کرنے کا سوچیں بھی، مسلمان کو تو کفر کو مٹانے کیلئے لڑنا ہے تا کہ اس کی جگہ اسلام لے۔ یہ ہے ان افکار کی حقیقت اور یہ ایک مسلمان کو جس طرف لے جاتے ہیں وہاں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ یہ افکار اس امت پر اس طرح چھائے ہوئے ہیں کہ وہ ان کی تشریح اور ترجمانی اس طرح کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ وہ کسی طرح سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ اس ذہنیت کی وجہ سے ہی مسلمانوں کو شکستِ فاش ہوئی اور کفار کو بڑی فتح حاصل ہوئی۔ ایک مرتبہ کفار جب مسلمانوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے اور اسلامی ریاست انہوں نے ختم کر دی تو تاریخ کا دھارا ہی مڑ گیا۔ اس پہلو سے بھی دنیا کا اقتدارِ اعلی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر کفار کے ہاتھوں میں چلا گیا یعنی اسلام سے سرمایہ دارانہ نظام کے پاس۔ کفار کے اس چیلنج سے مسلمانوں کو شکست کھا جانے کے بعد اسلامی افکار اور احکام کے اوپر جو انہیں اعتماد تھا وہ متزلزل ہو گیا اور اس میں انہیں خامیاں نظر آنے لگیں۔ اسلامی شریعت کی موزونیت کے تعلق سے سوالات اٹھنا شروع ہو گئے کہ یہ دورِ جدید کے مسائل کو حل کر سکتا ہے یا نہیں اور یہ موجودہ وقت کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہ اس کمزوری کی شروعات تھی جو امت کے وجود میں در آئی، کیونکہ امت لوگوں کا مجموعہ ہے جو ایک عقلی عقیدے سے باہم جڑتے ہیں جس سے ایک نظام درآمد ہوتا ہے جو معاشرے اور اس کے لوگوں کے روزمرہ کے معاملات کو منضبط کرتا ہے۔ امت کے اندر لوگ عقیدے سے نکلے ہوئے افکار کے مجموعے، کسوٹی اور اس سے لگاؤ کی بنیاد پر باہم جڑے رہتے ہیں۔ اس طرح اگر عقائد پر یقین کمزور ہو جائے تو یہ چیز

ریاست کی وحدت میں شک کی طرف لے جاتی ہے اور نتیجتاً زوال اور تباہی کا شکار ہوتی ہے۔ دراصل یہی چیز ہے جو واقع ہوئی اور اس بے یقینی اور شکوک کے نتائج ایک ہی صدی میں ظاہر ہوگئے۔ جب کفار اسلامی ریاست کو فوجی طاقت سے شکست دینے میں مایوس ہوگئے تو ان کے اندر یہ یقین جڑ پکڑ گیا کہ اسلامی ریاست کی فوج کو شکست نہیں دی جا سکتی۔ اس کے لئے انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور امتِ مسلمہ پر مغربی افکار سے حملہ کیا تاکہ اسلام پر مسلمانوں کا اعتماد کمزور پڑ جائے، جسم ڈھیلا پڑ جائے اور نتیجتاً اسلامی ریاست ختم ہو جائے۔ امت کی وحدت پر حملہ ریاست پر حملے کی طرف لے جاتا ہے جس سے لامحالہ ریاست کی وحدت کمزور پڑتی ہے اور اس کی تباہی بہت جلدی اور ناگزیر ہو جاتی ہے۔ کفار اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے خفیہ تنظیمیں، سکول، ہسپتال، اشتہاری پرچے (Leaflets) کتابیں اور مشنری گروپوں کو استعمال کرکے ذہنی مقابلہ آرائی کی طرف متوجہ ہوئے۔ شروع میں کافروں نے جزیرۂ مالٹا کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ 1625ء میں یہ بیروت منتقل ہوگئے اور اسے ان کاموں کیلئے استعمال کرنا شروع کیا۔ انہوں نے استنبول میں بھی کام کرنا شروع کر دیا اور اس جگہ کو بھی اپنی سازشوں کیلئے استعمال کیا۔ انگریزی اور فرانسیسی سفارت خانے امریکی اداروں جیسے پروٹیسٹینٹ کالج (Protestant College) سے مل کر بڑے جوش و خروش سے یہ کام کرنے لگے جو بعد میں بیروت کی امریکن یونیورسٹی (American University of Beirut) کے نام سے معروف ہوئی۔ انگلش اور فرانسیسی سفارت خانوں نے استنبول، دمشق، بیروت اور خاص طور سے قاہرہ میں دیوانگی کی حد

تک اس طرح کی سرگرمیوں کو بڑھایا۔ انہوں نے معاشرے میں ہر سطح کے لوگوں کو اپنا نشانہ بنایا لیکن سیاسی اور ذہنی طور پر لوگوں کو زیادہ متاثر کیا، یہاں تک کہ بہت سے طلبہ جنہوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی تھی، اور بہت سے تعلیم یافتہ اشخاص جو حکومت اور فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے مغرب کی طرف کشش محسوس کرنے لگے۔ اس چیز نے ان کے دلوں کے اندر مغربی تہذیب اور قوانین کیلئے محبت پیدا کر دی اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ شکوک پیدا ہونے لگے کہ اسلام موجودہ دور میں قابل عمل بھی ہے یا نہیں۔ مسلمان مغربی تہذیب کے ثمرات سے مستفید بھی ہونا چاہتے تھے اور ساتھ ہی اسلام کے تحفظ کے بھی دعویدار رہے۔ ان معاملات نے امت کے جسم کو کھانا شروع کر دیا اور بعد میں ریاست کو بھی کھا گئے، اسلامی ریاست توسیع کی حالت سے جمود اور زوال کی حالت میں آگئی اور امت کا کردار داعی کے بجائے اس مقام پر پہنچ گیا کہ کافر مسلم امت کو کفر کی دعوت دینے لگے۔ یہ کمزوری کی واضح علامات تھیں جو امت میں پھیلتی چلی گئیں اور یہ ریاست کے زوال کی شروعات تھی۔ تعلیم یافتہ لوگوں اور سیاسی حلقوں نے کافر ریاستوں کی ہدایت پر اس سلسلے میں بڑا تباہ کن کردار ادا کیا۔ جب ان معاملات میں اور اضافہ ہوا تو مغربی اقوام کے وہ ممالک جو اس کی رہنمائی کر رہے تھے خاص طور سے انگلینڈ اور فرانس اس پر مطمئن ہو گئے کہ یہ گندگی مسلم امت میں جڑ پکڑ رہی ہے اور اسلامی ریاست میں پھیلتی جا رہی ہے تو انہوں نے اسلامی ریاست کے علاقائی صوبوں پر فوجی حملے شروع کر دیئے اور اس کے کچھ حصوں پر قبضہ کر لیا۔ لالچ سے بھری ہوئی یورپ کی رہنما ریاستیں

انگلینڈ، جرمنی اور روس اس میں پوری طرح شامل ہو گئے۔ ان ریاستوں میں باہمی اختلافات کے باوجود کہ اسلامی ریاست سے چھینے گئے صوبوں کو آپس میں کس طرح تقسیم کریں، وہ اسلامی نظام کو ہٹانے اور ختم کرنے پر متفق تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے خلیفہ پر سب سے زیادہ اس بات کا زور ڈالا کہ وہ سیاست، معاشرت اور حکومت سے اسلامی نظام کو بے دخل کر کے مسلمان اور مغربی عدالت میں مغربی قوانین، اقتصادیات میں سرمایہ دارانہ نظام اور حکومت میں جمہوری نظام کو اپنائیں۔ ان اسباب کو سامنے رکھتے ہوئے یورپ کی رہنما کفار ریاستوں نے 1850ء میں ایک کانفرنس کا انعقاد کیا جو برلن کانفرنس کے نام سے جانی جاتی ہے۔ کانفرنس کے شرکاء میں کفر کے سردار انگلینڈ کی نمائندگی وہاں کے وزیر اعظم، ایک یہودی بنجامن ڈزرئیلی (Benjamin Desraeli) اور جرمنی کی نمائندگی چانسلر بسمارک (Prince Leopold von Bismarck) نے کی تھی۔ شرکائے کانفرنس نے اس بات پر اتفاق کیا کہ استنبول میں خلیفہ کو ایک میمورنڈم دیا جائے اور اس میں یہ مطالبہ رکھا جائے کہ وہ نظامِ اسلام سے دستبردار ہو اور اس کی جگہ دوسرا نظام نافذ کرے جو دیوانی قانون پر مبنی ہو۔ اس میمورنڈم میں بڑی سخت زبان استعمال کی گئی تھی اور اسے دھمکی کے انداز میں بھیجا گیا تھا۔ جب یہ میمورنڈم استنبول میں خلیفہ کو دیا گیا، اس وقت تعلیم یافتہ افراد اور سیاسی رہنماؤں نے دیوانی قوانین پر مبنی نظام کے قیام کے حق میں جو کہ وقت کے ساتھ چل سکے، کے لئے سرگرم مہم شروع کر دی۔ اس کا اثر خلیفہ پر بھی ہوا، پڑھے لکھے لوگوں اور سیاسی حلقوں میں یہ رائے بننے لگی کہ احکامِ شریعہ کو ہٹا کر اس کی جگہ مغربی قوانین

کو اپنائیں۔ اس کے لئے انہیں بہت زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ 1275ھ (1858ء) میں عثمانی تعزیری قانون (Ottoman Penal Code) کا اجرا ہوا۔ اس کے ایک سال بعد 1859ء میں تجارتی مسودۂ قانون (Trade & Commerce Bill) پیش کیا گیا۔ 1286ھ (1868ء) میں ایک رسالہ مجلہ شرعیہ کے نام سے نکالا گیا، کیونکہ علماء دیوانی قوانین کے جاری کرنے سے مطمئن نہیں تھے جیسا کہ سابقہ قوانین کے بارے میں وہ اپنی رائے کا اظہار کر چکے تھے، اسلئے انہوں نے شہری قوانین کو وقتی طور پر ان قوانین کا نفاذ ملتوی کر دیا اور رسالہ مجلہ شرعیہ کو دیوانی قوانین کے مقابلہ میں احکام شرعیہ کی حیثیت سے رجوع کرنے کیلئے استعمال کیا۔ نیتجتاً شرعی قوانین اپنے دلائل کی بنیاد پر پیش نہیں کئے گئے بلکہ اس بنیاد پر کہ وہ فرانسیسی دیوانی قوانین سے متصادم نہ ہو۔ 1288ھ (1870ء) میں اسلامی ریاست کی عدالتیں دو حصوں میں تقسیم ہو گئیں، محاکمِ شرعیہ اور سرکاری قانونی عدالتیں۔ ان دونوں پر نظر رکھنے کیلئے الگ سے ایک نظم قائم کیا گیا۔ 1295ھ (1877ء) میں سرکاری عدالتوں کے ڈھانچوں کو سدھارنے کیلئے ایک مسودۂ قانون (Bill) لایا گیا اور 1296ھ (1878ء) میں ایک قانون بنایا گیا جس میں شخصی یا انفرادی حقوق کے اصول بتائے گئے تھے، جس کی خلاف ورزی ہونے پر قانونی کارروائی کرنے کی گنجائش تھی۔ اس طرح مغربی قوانین نے اسلامی شریعت کی جگہ لے لی۔ جب مفکرین کے ذریعہ یہ چیز آشکارا ہوئی تو سیاسی رہنما امتِ مسلمہ کی رائے کے وزن کی وجہ سے پریشان ہوئے۔ اس کے علاوہ یہ حقیقت ہے کہ اسلام ایک بنیاد ہے جس پر بین الاقوامی منظر نامہ اور اسلامی دنیا میں ایک

ریاست قائم تھی اور یہ کہ یہ اسلامی ریاست ہی تھی جس میں یہ قوانین اختیار کئے گئے جن کیلئے فتویٰ دیا گیا اور دعویٰ کیا گیا کہ یہ قوانین اسلامی ہیں۔ محمد علی اور اس کے بیٹوں میں جو صوبۂ مصر میں حکومت کر رہے تھے اپنے فرانسیسی آقاؤں کے اشاروں پر اس طرح چل رہے تھے کہ انہوں نے اس تکلف کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔ پرانا مصری دیوانی قانون فرانسیسی دیوانی قانون سے نقل کیا گیا، یہ کیونکہ فرانسیسی زبان میں تھا اسلئے اس کا عربی میں ترجمہ کیا گیا تاکہ اس کے لئے کچھ جواز نکالا جاسکے۔ عملاً مغربی فقہہ نے شریعت کی جگہ لے لی اور یہ قانون ایک اسلامی ریاست میں نافذ ہونے لگا، اب ریاست کے پاس سوائے نام کے اور کچھ نہیں بچا۔ مفکرین، سیاست دانوں اور تعلیم یافتہ افراد کے دماغوں پر مغربی افکار و تصورات اس بری طرح چھائے کہ اس کے اثرات پورے سیاسی ماحول پر پڑنے لگے اور دوسرے حلقے بھی اس اثر سے بچ نہیں پائے۔ اسلئے اسلامی ریاست کی تباہی یقینی تھی، اب سوال یہ نہیں تھا کہ یہ ریاست ختم ہوتی ہے یا نہیں بلکہ یہ تھا کہ یہ کب ختم ہوتی ہے۔ یہ سب اسلئے ہوا کہ امتِ مسلمہ نے حکومت اور عدالت کیلئے جو اسلامی قوانین تھے اُنہیں چھوڑ دیا اور اس کا اسلام کے تعلق سے اعتماد کہ یہ موجودہ زمانے کے مسائل کو حل کر سکتا ہے اور زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے، متزلزل ہو گیا۔ مزید یہ کہ جن لوگوں پر اسلام کو نافذ کرنے کی ذمہ داری تھی وہ اس طرح سوچنے لگے کہ اب ضرورت ہے اسلامی شریعت کو چھوڑنے اور اس کے بجائے سرمایہ داری نظام کو اپنانے کی۔ ان لوگوں کیلئے اب صرف یہ طے کرنا باقی تھا کہ انہیں اب کس انداز سے اختیار کیا جائے۔ اس طرح اسلامی ریاست کا زوال اور نظامِ خلافت کا

خاتمہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ امت اس حالت پر پہنچ گئی کہ شریف حسین جس کا دعویٰ تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی رضی اللہ عنہا کی اولاد میں سے ہے حجاز کی امارت پر قابض ہو گیا اور مقدس شہر مکہ اور متبرک خانۂ کعبہ کے پڑوس سے خلیفہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس کی اتنی ہمت ہو گئی کہ کفار کے رہنما انگریزوں کی طرف سے اس نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کی اور امت میں ایسا کوئی شخص بھی نہیں پایا گیا جس نے اس اقدام کے خلاف نفرت کا اظہار کیا ہو۔ اگر امت کی سوچ اسلامی ہوتی یا امت پر اسلامی افکار کا کچھ بھی اثر ہوتا تو یہ صورتِ حال پیدا نہ ہوتی۔ اتنا ہی کافی نہ تھا عثمانی فوج کے ایک افسر کمال پاشا نے خلیفہ کے خلاف بغاوت کر دی اور انقرہ میں علیحٰدہ سے ایک حکومت قائم کر لی۔ اس کے بعد اس نے خلیفہ کے خلاف جنگ کی، اسے شکست دی اور نظام خلافت کو اس نے مسلمانوں کی زندگی سے ختم کر دیا۔ اس سب کے باوجود امت میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جس میں یہ ہمت ہوتی کہ وہ کمال پاشا کو چیلنج کرتا اور مسلمانوں کو ساتھ لیکر اس کے خلاف جنگ میں خلیفہ کا ساتھ دیتا۔ اس کے بجائے امت نے کمال پاشا کی طرفداری کی اور بہت ہی کم لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ اب یہ ناگزیر تھا کہ اسلام سیاسی منظر نامہ سے ہٹے اور زندگی کے معاملات سے نظامِ خلافت بے دخل ہو جائے۔

سوال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے افکار و جذبات اسلام سے وابستہ ہوتے تو جو کچھ یہ ہوا کیا وہ ممکن تھا؟ اگر مسلمانوں کی نظر میں نظامِ خلافت کی بقاء اور اس کا قیام اتنا ہی ضروری ہوتا جتنا اسلامی عقیدہ، تو نظامِ خلافت کے ہٹائے جانے پر یہ ایک فطری امر ہوتا کہ مسلم دنیا میں اس کا ردِ عمل ایسا

پر تشدد ہوتا کہ پوری امت کو ہلا کر رکھ دیتا۔ یہ حقیقت ہے کہ امت کے اندر کوئی ایسا رد عمل نہیں ہوا۔ سرزمینِ ترکی میں انفرادی طور پر کچھ احتجاج ہوا، جو عوامی شکل اختیار نہیں کر پایا اور عرب سرزمین میں بھی کچھ غیر اہم افراد کی طرف سے احتجاج کیا گیا جن کی تعداد بہت قلیل تھی۔ اس کے برخلاف عرب لوگوں نے بڑے غدار شریف حسین اور اس کے لڑکوں فیصل اور عبداللہ کی حمایت کی جنہوں نے خلیفہ کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے اور انگریز کافروں کی فوج کے ساتھ مل کر اسلامی ریاست کی فوج کے خلاف جنگ کی۔ انہوں نے مسلمانوں کے قتل عام میں کافروں کا ساتھ دیا۔ خلیفہ کی حمایت میں کوئی جذبہ دکھانے کے بجائے سرزمینِ عرب کے لوگ شریف حسین کے خاندان کی حمایت میں کھڑے ہوگئے۔ مصر میں انفرادی اشخاص نے اس سب کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ یہ اظہار کچھ نظموں کی شکل میں ہوا اور اس سلسلے میں کچھ لوگوں نے 1924ء میں خلافت کیلئے ایک کانفرنس کا بھی انعقاد کیا۔ اسی سال خلافت بھی ختم ہوئی تھی۔ ہندوستان کے لوگوں نے خلافت کے نقصان کو زیادہ محسوس کیا اور اس کیلئے زبردست رنج و غم کا اظہار اور احتجاج کیا۔ مصری شعراء میں شوقیؔ ایسے شاعر تھے جنہوں نے مرثیوں کے ذریعہ خلافت کی حمایت میں اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا: ۔

وہ نغمہ ہائے سرخوشی بدل گئے ہیں ماتمی صداؤں میں
تمہاری موت کی خبر مسرتوں سے دی گئی
لباسِ عروساں بنا تمہارے جسم کا کفن

بوقتِ دفن خوف کی 'محافظت'، ہنسی کے آنسوؤں کے ساتھ تھی عیاں
ہر اک جگہ ہے بے حسی ضمیر کی جو روح کا عذاب ہے
میناروں اور منبروں پہ شور ہے
تمہاری سلطنت بھی تم سے ہے خفا
پریشاں ہند و مصر ہیں پکارتے ہیں بہتے آنسوؤں کے ساتھ
عراق و شام پوچھتے ہیں
کون ہے وہ کون کہ جس نے ہم سے چھین لی خلافتوں کی سرزمین
جنازے میں عظیم اور اچھے لوگ ماتمی فضاؤں میں گھرے ہوئے!
وہ قتل اک ذاتِ باصفات کا
کوئی گناہ یا قصور کے بغیر!

اس کے بعد شوقیؔ نے ان لوگوں کی تصویر کشی کی ہے جنہوں نے دشمنوں کے خلاف جنگ سے ان زخموں پر مرحم لگایا جو خلافت پر پڑ گئے تھے۔ جو امن مسلمانوں نے اتحادیوں (Allies) کے ساتھ قائم کیا وہ خلافت کے خاتمے تک ان کو لے گیا۔ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی عظیم ترین شان و شوکت کو انہوں نے تار تار کر دیا اور اپنی گردنوں سے شاندار زیوروں کو اتار پھینکا۔ صدیوں کی محنت سے بنائی ہوئی زمانے کی شان کو پلک جھپکنے سے بھی کم وقت میں ختم کر دیا۔ وہ کہتے ہیں:ے

وہ اُن کا امن تھا کہ جس نے جان لی تمہاری، زخم کے دیئے بغیر!
خود اپنے ہاتھ سے لباس تار تار کر دیئے

کشیدہ کاریاں تھیں جن پہ فاتحین کی
بدن کے شال اور گلے کے ہار بھی الگ ہٹا دیئے
فضا وہ احترام کی
بس اک نفس میں ہی تمام ہو گئی

اب شوقؔ خلافت کے بندھن کا ذکر کرتے ہیں کہ کس طرح یہ بندھن ٹوٹ گئے جبکہ یہ ایک عظیم الشان رشتہ تھا جو کہ بھائیوں کو باہم جوڑے ہوئے تھا اور ان کی روحوں کو باندھے ہوئے تھا۔ اس نے ایک نظام کے تحت سب کو منظم کر دیا تھا اور ہر طرح کے حالات میں انہیں ایک صف میں کھڑا کر دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ خلافت ختم کرنے جیسا مکروہ کام ہونا ممکن نہیں تھا جب تک کہ اسے کرنے والا خود بے شرم اور غدار نہ ہو۔ ان خیالات کی شوقؔ نے یوں شعر بندی کی ہے:۔

سبب وہ سب کے سب تمام ہو گئے
جو وجہ تھے تمام رشتۂ وجود کی
تھیں جن سے استواریاں ہر ایک روح کی
یہ تقویٰ تھا کہ جس نے سب کو ایک کر دیا
سب کو نیک کر دیا
صلوٰۃ جمعہ نوحہ گر بنی
یہ سب کی سب سُروں کی ساز باز تھی
شریعتوں کے فیصلے بھی

## بد تمیزوں کی زد پہ آ گئے!

جو کچھ اس نے اعلان کیا وہ اس مکروہ اور غدار آدمی کے ذریعہ کھلا ہوا کفر تھا یعنی ایسا قطعی کفر جو عوام کے سامنے کیا گیا۔ اس سلسلے میں شوقیؔ نے ایک شاندار حدیث کا حوالہ دیا، جب صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا:

(قيل يا رسول الله اَفَلا ننا بذهم بالسيف؟ فقال: لا، مَا اَقَاموا فِيكم الصلاة، إلاَّ اَنْ تروا كُفراً بواحاً)

اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں ان کے خلاف اعلان جنگ نہ کر دینا چاہئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: نہیں، جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتا رہے سوائے اس کے کہ جب تم کفر بواح (کھلا ہوا کفر) دیکھو۔

شوقیؔ نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ اس گستاخ آدمی نے خلافت کے خاتمے کیلئے جو کچھ کیا وہ کھلے ہوئے کفر کے درجہ میں آتا ہے، اسلئے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دینا چاہئے۔ وہ کہتے ہیں: ۔

کہا جو اُس نے جھوٹ تھا
وہ کفر تھا جو سارے ملک میں نفاذ پا گیا

ترکوں کے خاموش رہنے پر شوقیؔ نے ان کی ملامت کی۔ وہ کہتے ہیں انہوں نے خلافت کی اہمیت اور عظمت کو ہی نہیں سمجھا، اسے خود اپنے درمیان سے ختم کر دیا اور جو کچھ ہوا اس کا انہیں احساس بھی

نہ ہوا جبکہ یہ لوگ تو صرف جنگ کیلئے پیدا ہوئے تھے۔ یہ تو صرف جنگ کی ہی بات کرتے تھے اور صرف جنگ کی ہی زبان جانتے تھے۔ اس اہم معاملے میں ان کی ناسمجھی پر شوقؔ فرماتے ہیں: ۔

وہ لوگ جن کی فکر ختم ہو گئی
وہ جنگ کیلئے جہاں میں آئے تھے
زباں پہ اُن کی گفتگو لڑائی کی
خطاب اُن سے کیا کرو کہ جانتے تھے بس زبان تیغ کی

شوقؔ پھر کمال پاشا پر، جس کی کہ وہ کبھی تعریف کیا کرتے تھے حملہ آور ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کو یقین ہے کہ سچائی کا تقدس بہر حال افراد کے تقدس پر حاوی ہوتا ہے، اسلئے اس سابقہ مدحت کے باوجود ایک شخص کے مقابلے حق کی حمایت زیادہ ضروری اور موزوں ہے۔ اسلئے سچ کی حمایت کرنا چاہئے اور وہ آدمی جو چاہے کتنی ہی بڑی شخصیت کا مالک ہو، سچائی کی چوٹ سے اسے شکست دی جا سکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ۔

میں معافی چاہتا ہوں
میں جو خوش اخلاق ہوں
کل تلک جس کی طرفداری کیا کرتا تھا میں
باندھتا تھا اس کی تعریفوں کے پُل
اب اُن کو کیا الزام دوں

سلطنت کا وہ ستونِ آخری
سیاست کی اساس
جنگ کا ہیرو بہادر مرد جس نے
زندگی دی امیرِ ارتداد کو!
دوستی سچائی ہے سب سے مقدس
اور ہم سب کی حمایت چاہتی ہے
لوگ تعریفوں کے پُل توباندھتے ہیں
اور سچائی کی ہر لمحہ ملامت کر رہے ہیں
اب یہی بہتر ہے خود کو دور رکھیں
مشورے دینے سے اپنے باز آئیں
دیکھنے میں جو توانا لگ رہے ہیں
سخت بازو اور اُن کے جسم موٹے
سچ سے جو ہوا سامنا، میدان سے لاغر لوٹے

اب کمال پاشا کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے گناہ سے توبہ کرلے، وہ گناہ جو اس نے اسلامی عقیدہ چھوڑ کر اور شریعت کو ریاست کی حکومت اور زندگی کے معاملات سے ہٹا کر کیا ہے۔ اس کی جگہ وہ کافروں کا سرمایہ دارانہ نظام لایا، یہ مغربی قانون اور دین کو دنیوی معاملات سے علیحدہ کرنے کا عقیدہ ہے۔ شوقی کہتے ہیں:۔

مردِ غازی کو ذرا یہ مشورہ دو
شاید کبھی وہ مان جائے
ریس کا گھوڑا تھا وہ جو سرکشی کر لوٹ آیا
صدر ڈوبا ہے شرابوں کے نشے میں
فہم اور ادراک کے ہوتے ہوئے بھی
مستقل صاغر کا عادی ہو گیا ہے۔
ہر عقیدہ کھو گیا ہے
لوگ لشکر کی طرح میدان میں ہانکے گئے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے ترک لوگوں پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ انہوں نے کمال پاشا کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ جو چاہے کرے۔ ترکوں نے کمال پاشا کو ادب و احترام میں اتنا بڑھا دیا کہ خدا کے درجہ تک پہنچا دیا اور اپنے اوپر حکمرانی کرنے کی کھلی چھوٹ دیدی یہاں تک کہ وہ ہر وہ چیز کرنے لگا جس کا اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، عوام کی اطاعت اور قدر و منزلت سے وہ بے قابو ہو گیا۔ یہ سب اسلئے ممکن ہو سکا کیونکہ امت کی بیداری کی سطح بہت بلند نہ تھی اور ایسی نا سمجھ امت میں یہ اہلیت ہی نہ تھی کہ وہ اپنی شان و مقام کو سمجھ سکتی یا اس کیلئے وہ اپنی جان دینے کو تیار ہوتی، وہ اپنی شان کو جان ہی نہ پائی سوائے اس کے کہ وہ اسے ایک چمکتا ہوا سراب سمجھتی رہی۔ شوقیؒ اپنی بات جاری رکھتے ہیں:۔

مقدس روح کی مانند اس کی ماں نے چھوڑا تھا
عبادت روح کی، اک چپ لگا دیتی ہے ہونٹوں پر۔
میسر اُس کو تھیں مختاریاں قیصر کی طرح
بس اسلئے ہی وہ غلط انداز سارے کام کرتا تھا
عوام الناس کی بے جا اطاعت نے اسے مسحور کر ڈالا
رعایا پر بظاہر اک اطمنان طاری تھا
اگر اس امتِ بے شعور سے اُس کی شان چھن جائے
کچھ نہ رہ جائے گا اس کے پاس اک سراب کے سوا۔

شوقیؔ اپنی نظم مسلمانوں کو خلافت کے خاتمہ کے نتائج سے خبر دار کرتے ہوئے ختم کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اس کیلئے بھی منع کرتے ہیں کہ وہ شریف حسین کو اپنا خلیفہ بنائیں جس نے اسلامی ریاست کی فوج کے خلاف جنگ میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ شوقیؔ پیشگوئی کرتے ہیں کہ اب خلافت کے خاتمے کے بعد کیا ہو گا۔ شوقیؔ تنبیہ کرتے ہیں کہ اب ایسے کئی لوگ ہونگے جو جھوٹ اور کفر کی طرف دعوت دینگے اور مسلمانوں کو دینِ اسلام سے منحرف کر کے دور لے جائیں گے۔ اسلامی سرزمین کے ہر ٹکڑے پر مسلمان اسلام کو چھوڑنے، سچائی سے جھوٹ کی طرف اور ہدایت سے گمراہی کی طرف جانے میں کشش محسوس کریں گے۔ ہر شخص کیلئے ایک طرف رشوت کا لالچ ہو گا اور دوسری طرف دھمکی۔ دوسرے الفاظ میں ان کیلئے وعدے بھی ہونگے اور

دھمکیاں بھی، ایک طرف پھل کی لالچ تو دوسری طرف ڈنڈے کا خوف اور اسی طرح کی چیزیں۔ وہ خلافت کی حمایت میں پیشگوئی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

کوئی ایسا ہے جا کر جو مسلمانوں سے یہ کہہ دے
خلافت چیز ہے ایسی، حفاظت جس کی کرنا ہے۔
قلم کی روشنائی اُس کی خاطر خرچ کرنا ہے
یہ سب اللہ کی سچی محبت کا ثمر ہے اور جاری ہے۔
یہ سچائی سے الفت کا نتیجہ ہے
یہی اصلاح سازی کا طریقہ ہے۔
میں اک ایسا دیا ہوں جو مسلسل جھلملاتا ہے
میں ایسا ہی رہونگا جب تلک پروانہ بن جاؤں۔
ادہم کی مہم جوئی تاج ہے میرے ہی لفظوں سے!
کامرانیاں انوار کی مفسر ہیں مرے اوراق میں
مگر گم ہو گئیں وہ ساری تلواریں وہ بھالے
اور قلم لکھتا ہی جاتا ہے بنا ٹھہرے ہوئے!
نبیؐ کا وہ لباسِ فاخرہ ہر کس وناکس کو مت دینا
ایک نہتے کو شراب یر غوانی سے بچایا جارہا ہے
جس نے امت کو ہزاروں زخم دے ڈالے بہت کمزور کر ڈالا

بڑھاتا ہے وہ اپنا ہاتھ اک جراح کی صورت!
سنو گے ایک ہی آواز ہر جانب پکارا جا رہا ہے
کذاب (مسیلمہ) کو سجاح کو
ہر ایک خطہ زمین کا آزمائش لے کے آیا ہے
جہاں پر دین بیچا جا رہا ہے سستے داموں میں!
دیئے جائیں گے فتوے المعز کی تیغ اور سونے کی خاطر
خبطی پن اور مسلسل کینہ کی خاطر

اس میں شوقیؔ نے المعز لدین اللہ الفاطمی کا حوالہ دیا ہے جب کہ وہ قاہرہ میں داخل ہوا اور سونا اور تلوار ہاتھ میں لیکر چلّایا، " یہ ہے میرا خاندان اور میری عزت " !لوگ اس کے اوپر برہم ہوئے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے بیٹے ہو"۔ شوقیؔ اپنے آخری شعر میں کہتے ہیں کہ لالچ اور خوف کی اسی بنیاد پر فتوے جاری کئے جائیں گے۔

یہ احساس جو دلوں کی روحانی تکلیف کا عکاس تھا جو بعض لوگوں کو خلافت کے خاتمے کے صدمہ کی وجہ سے پہنچی تھی، یہ تکلیف کچھ افراد تک محدود تھی جن کی تعداد سینکڑوں میں یا زیادہ سے زیادہ ہزاروں میں ہو گی۔ تاہم افراد، افراد ہی ہوتے ہیں اور یہ تعداد خلافت کے تحفظ کیلیئے کافی نہیں تھی، اسی لئے خلافت کا خاتمہ ہوا جس کے نتیجے میں اسلامی ریاست کا وجود مٹ گیا، پوری دنیا میں سیاسی زندگی اور معاشرے سے جدا ہو کر اسلام ایک ماضی کی داستان بن کر رہ گیا۔ اتنا سب ہونے

پر بھی مجموعی طور پر امت مسلمہ میں کوئی بے چینی پیدا نہیں ہوئی۔ اس سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ امتِ مسلمہ کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ خلافت کے خاتمے کے ساتھ ہی تمام مسلم علاقوں پر کفار نے خود مسلمانوں میں سے ہی ایسے حکمراں مسلط کر دئے جو مسلمانوں پر سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی نافذ کرنے لگے۔ یہ حکمراں کفار سے بھی بڑھ کر اسلام دشمن تھے اور ان کی پوری کوشش یہ رہی کہ اسلام سے کس طرح پیچھا چھڑایا جائے۔ کئی دہائیاں گزرنے کے بعد بھی ابھی تک امتِ مسلمہ کافر کے زیرِ تسلط ہے۔ کفار کی طاقت کا اثر اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ اب یہ امت تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے رحم و کرم کے علاوہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو اسے اس تباہی سے بچا سکے کیونکہ اسلام میں سے کوئی چیز اس کے پاس باقی نہیں بچی ہے۔ آخر کار دین اور دنیا کی علیحدگی کیا ہمارے معاشرے کے ہر طبقہ کی عام رائے نہیں بن گئی ہے؟ اس رائے کے تعلق سے سیاست دانوں اور عوام میں کوئی فرق نہیں ہے، نہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ افراد میں اور نہ ہی جوان اور بوڑھے میں، یہ تمام لوگ دین کو زندگی کے معاملات سے الگ کرنے کے سلسلے میں ایک ہی رائے رکھتے ہیں۔

دین کو ریاست کے معاملات سے الگ کرنے کا عقیدہ کفر سے بھرا ہوا ہے اور جو بھی اس عقیدے پر یقین رکھتا ہے وہ اسلام کی رو سے مُرتد ہے۔ اس کی دلیل اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿وَ أَنِ إحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ﴾

”اور تم اُن کے درمیان وہی فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے“۔ (سورہ المائدہ؛5:49)

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو نہ ماننا:

﴿وَأَقِيْمُواْ الصَّلاةَ﴾

”اور نماز قائم کرو“۔ (سورہ بقرۃ: 2:110)

اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿وَالسَارِقُ وَ السَارِقَةُ فَأَقْطَعُواْ أَيْدِيَهُمَا﴾

”اور چور چاہے مرد ہو یا عورت، ان کے ہاتھ کاٹ دو“۔ (سورہ المائدہ: 5:38)

اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَآتُواْ الزَكَوٰةَ﴾

”اور زکوٰۃ دو“۔ (سورہ بقرۃ: 2:110)

یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ دنیوی زندگی کے معاملات کو دین سے الگ کرنے کا واضح مطلب یہ ہوا کہ حکومت و اقتدار سے متعلق آیات اور عقوبات (سزائیں) و معاملات کے تعلق سے آیات کا انکار کرنا اور صرف عقیدے اور عبادات سے متعلق آیات پر یقین کرنا سراسر کفر ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿أَفَتُومِنُونَ بِبَعْضِ الكِتَابِ وَ تَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزاءُ مَنْ يَّفْعَل ذَلِك مِنْكُمْ إلاَّ خِزْىٌ فِي الحَيَاةِ الدُنْيَا وَ يومَ القِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أشَدِّ العَذابِ﴾

”تو کیا تم کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے پھر تم میں جو ایسا کرے، اس کا صلہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں بھی رسوائی ہو اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو سخت سے سخت عذاب کی طرف پھینک دیا جائے“۔(سورہ بقرۃ:2:85)

اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے:

**﴿إنَّ الَذِينَ يَكْفُرُونَ بَاللّٰهِ وَ رُسُلِهِ وَ يُرِيْدُونَ أَنْ يُفَرِّقوا بَينَ اللهِ وَ رُسُلِهِ وَ يَقُولُونَ نُؤمِنُ بِبَعْضٍ وَ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَ يُرِيدونَ أنْ يَّتَّخِذُوْا بَينَ ذٰلِکَ سَبِيْلاً أُوْلٰئِکَ هُمُ الكَافِرُونَ حَقاً ﴾**

”جو لوگ اللہ اور اسکے رسولوں کے ساتھ کفر کی روش اختیار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنا چاہتے ہیں، اور اس خواہش میں ہیں کہ درمیان کی کوئی راہ اختیار کریں، کہتے ہیں کہ "ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے" یہی لوگ پکّے کافر ہیں“۔(سورہ النساء:151،5:150)

مزید یہ کہ دین کو عملی طور پر ریاست سے جدا کر دینے کا معاملہ امت کی ایک عام رائے بن گئی یعنی مسلم امت نے ہر علاقے میں اس کے اثرات محسوس کرنا شروع کر دئے ہیں۔ یہاں تک کہ بہت سے افراد جو اس نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کرتے، وہ بھی یہ رائے رکھتے ہیں کہ عام لوگ ایسا ہی سوچتے ہیں۔ اس کے علاوہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اب جو رشتہ رہ گیا ہے وہ دوستی، پڑوس یا باہمی مفاد کی بنیاد پر ہی باقی بچا ہے؟ کیا مسلمانوں کے درمیان اسلامی بھائی چارے کا

رشتہ مفقود نہیں ہو گیا ہے؟ اور مختلف مسلم علاقوں میں مسلمانوں کی عام رائے اس رشتے کے تعلق سے کوئی احساس نہیں رکھتی۔ بلکہ مسلم علاقوں کے مسلمانوں کے عام افراد دوستی، پڑوس یا باہمی مفاد کے رشتے کے تعلق سے ہی بات کرتے ہیں۔ آج سوائے چند افراد کے کوئی بھی اسلامی اخوت کے رشتے کی بات نہیں کرتا حالانکہ مسلمان جس رشتے سے آپس میں جڑتے ہیں وہ صرف یہی رشتہ ہے اس کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾

”مومن تو بھائی بھائی ہی ہیں“۔ (سورہ الحجرات: آیت:۱۰)

اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(اَلمسلمُ اَخ المسلم)

”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے“۔

معاملہ یہیں ختم نہیں ہو گیا، بلکہ انہی لوگوں کا رشتہ مادرِ وطن (وطن پرستی)، نسل پرستی اور قوم پرستی میں تبدیل ہو گیا۔ کیا یہ سچائی نہیں ہے کہ شام کے مسلمان ترکی مسلمانوں کو غیر ملکی سمجھتے ہیں، لبنان میں ایرانیوں کو غیر ملکی تصور کیا جاتا ہے اور ہندوستانی کو حجاز میں غیر ملکی سمجھا جاتا ہے؟ حقیقتاً امتِ مسلمہ کے افراد کے ساتھ مختلف مسلم علاقوں میں غیر ملکیوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے کیا مسلمانوں کو اپنے مادرِ وطن کے نام پر اکسایا نہیں جاتا تا کہ ان کے جذبات کو بھڑکایا جائے جبکہ اسلامی خلافت کے قیام اور اسلام کے نفاذ کیلئے کوئی جذبات نہیں پائے جاتے۔ کیا اس بات پر بھی

وہ مطمئن نہیں ہو گئے کہ کسی عیسائی کو کافر کہنا مناسب نہیں ہے، اس کے بجائے اسے ایک شہری کی حیثیت سے دیکھنا چاہئے۔ جبکہ اس تعلق سے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

**﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُواْ إِنَّ اللهَ هُوَا المَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَ قَالَ المَسِيْحُ يَا بَنِى إِسْرَائِيلَ أَعْبُدُواْ أَللهَ رَبِّي وَ رَبُّكُمْ﴾**

”یقیناً انہوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ، "اللہ وہی مسیح ابن مریم ہی ہے" حالانکہ مسیح نے کہا تھا "اے بنی اسرائیل ‘اللہ کی بندگی کرو‘ جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے“۔ (سورہ المائدہ: 5:72)

کیا یہ بات نہیں ہے کہ جہاد کو آج صرف دفاعی جہاد سمجھا جاتا ہے اور مادی ذرائع (یعنی جہاد) سے اسلام پھیلانے کا تصور ختم ہو گیا ہے؟ کیا یہ نظام ہائے کفر کی طرف رجوع نہیں ہے؟ ”قومی ریاستوں کے درمیان غیر جانبداری“، ”سیاست جھوٹ اور دھوکا ہے“، ”اسلام جمہوریت ہے“، ”اور اسلام سوشلزم میں کوئی تضاد نہیں ہے“۔ اس طرح کے اور دوسرے تصورات جو اسلام کی نظر میں کفر ہیں، آج مسلمانوں کے غالب افکار ہیں۔ کیا آج مسلمانوں کیلئے کسی چیز کو جانچنے کی کسوٹی شرعی دلیل کے مقابلے میں ذاتی مفاد یا فائدہ نہیں ہے؟ کیا کسی چیز کا اچھا (حسن) یا برا (قبح) طے کرنے کی کسوٹی شریعت نہ ہو کر عقل یا انسانی دماغ نہیں ہو گیا ہے؟ کیا ہم مغربی ریاستوں کو صرف استعمار کی حیثیت سے دشمن نہیں سمجھ رہے ہیں نہ کہ کفار کی حیثیت سے؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ آج مسلمان خلافت کی واپسی اور اسلامی حکومت کے قیام کو ایک ناممکن خواب سمجھ رہے

ہیں؟ یہ آج امت کی حالت ہے جہاں وہ ایک جسم کے مانند نہیں ہے جو ایسے عقیدے کی بنیاد پر متحد ہو جس سے ضوابط اور قوانین کا ایک پورا نظام وجود میں آتا ہو۔

آج امت کی صورتِ حال یہ ہے کہ جو نظام اس پر نافذ ہونا چاہئے عملی طور پر وہ اپنے عقیدے سے کٹ گیا ہے اور عام لوگوں کی رائے بھی اس کے حق میں نہیں رہی ہے۔ امت نے یہ بات ایک ناقابلِ تغیر حقیقت کے طور پر قبول کر لی ہے۔ اس طرح سے یہ امت ایک بندھن میں بندھی ہوئی تھی جبکہ وہ ایسے لوگوں پر مشتمل جماعت تھی جن کے افکار، معیار اور یقینِ کامل ایک عقیدے سے ہی نکلے ہوئے تھے۔ آج امت کے افکار، معیار اور یقین جن چیزوں پر ہے ان کی اکثریت غیر اسلامی ہے، اس طرح امت کی وحدت کیسے برقرار رہ سکتی ہے جبکہ امت کو ایک اسلامی امت بنانے والے یہ عوامل بدل بھی گئے ہیں اور کمزور بھی ہو گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت امت تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ امت اس وقت ایک دوراہے پر کھڑی ہے، کیونکہ ایسا تو ایک صدی قبل ہوا تھا جب امت نے اسلامی افکار کے ساتھ سرمایہ دارنہ مغربی افکار کو قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ امت تباہی کی طرف گامزن ہے، کیونکہ یہ تو اس دن کی بات ہے جب خلافت کا خاتمہ ہوا اور اللہ کا قانون دنیا سے ہٹا دیا گیا تھا۔ آج کا معاملہ تو یہ ہے کہ اسلامی احکام کو ریاست سے الگ کرنا، عام رائے بن چکا ہے اور اسی عام رائے پر ساری وفاداری اور اعتبار ہے، رہے اسلامی افکار تو یہ بس کچھ ذہنوں میں پرانے کھنڈروں کی طرح بچے ہوئے ہیں جن سے بعض لوگوں کو محض ایک جذباتی لگاؤ ہے اور بعض اسے

بھی حقیر اور بے وقعت سمجھتے ہیں، اور جہاں تک اسلامی مشاعر اور جذبات کی بات ہے تو یہ بھی اب انسانی نفوس میں ناپید، اور زندگی کے معاملات سے بالکل بے دخل ہیں۔ ان تمام چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ امت اب ایک ایسے مقام پر کھڑی ہے جہاں سے فنا میں اور اس امت میں کوئی فاصلہ نہیں رہ گیا ہے بس فنا کا اطلاق ہونا باقی ہے۔

**اے مسلمانو!**

یہ ہے حقیقت امتِ مسلمہ کی، اس کا اسلام پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے اور وہ یہ سمجھنے لگی ہے کہ اسلام بحیثیت ایک نظام کے جدید زمانے کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اسلام کے افکار اور اس کا نقطۂ نظر زندگی کے معاملات سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اسلامی شریعت کو ریاست سے جدا کر دیا گیا۔ مسلمان یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلامی افکار اور شریعت سے ان کی علیحدگی، زندگی اور ان کے وجود اور دوسری قوموں کے ساتھ ترقی کیلئے ضروری ہے۔ اس طرح امت کا مسئلہ یہ ہے کہ اسے اسلامی نظام پر اعتماد نہیں رہا، یہ بات نہیں ہے کہ اسلام سے ہی اس کا اعتماد اٹھ گیا ہو۔ اس وجہ سے اس نے اپنی وہ طاقت کھو دی جو زندگی کو چلانے کیلئے ضروری ہے۔ وہ ایسی جامد اور غیر مؤثر حالت میں پہنچ گئی ہے جہاں تباہی کا گڑھا اس کے سامنے ہے اور اس کا وجود ہی خطرے میں ہے۔ اس طرح امتِ مسلمہ کا مسئلہ یہ ہے کہ اس نے زندگی کے متعلق افکار کی شکل میں اور رشتوں کو منظم کرنے والے نظام پر سے اپنا اعتماد کھو دیا ہے جو کہ دراصل اسلامی عقیدے سے ہی بر آمد ہوتا ہے۔ یہ اعتماد کھونے کے

بعد اسلامی عقیدے پر یقینِ کامل کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مضبوط محرک جس سے پوری امت کی گاڑی چلتی ہے ختم ہو گیا۔ یہ ہے اصل بیماری جس کی ہم واضح طور پر تشخیص کر سکتے ہیں، یہی ہمارے مطالعہ اور غور و فکر کا موضوع ہونا چاہئے اور اسی کے علاج کی ضرورت ہے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہو گا کہ امت کا مسئلہ اسلامی عقیدے پر اس کا شک کرنا ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا ایمان ہی مشکوک ہے، جو کہ سراسر غلط اور بہت ہی خطرناک بات ہے۔ اسلامی عقیدہ ہر مسلمان کے اندر موجود ہے لیکن اس میں تین اہم چیزیں اس سے چھوٹ گئی ہیں: زندگی کے افکار سے اور نظام ہائے قانون سازی سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے اسلئے اس کی قوتِ حیات مضمحل ہو گئی، کیونکہ ایک معقول عقیدہ جب اپنے افکار سے جدا ہو جائے تو اس کی روح نکل جاتی ہے اور یہ ایک بے جان فوجی دستہ کی طرح رہ جاتا ہے۔ زندگی کے بعد کے حالات کا تصور ختم ہو جاتا ہے اسلئے وہ زندگی کے اعمال اور معاملات میں یومِ قیامت کو شمار میں نہیں لاتا۔ وہ نہ تو اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہے نہ اسے جنت کی ترغیب ہوتی ہے اور نہ جہنم کا خوف رہتا ہے۔ اسی طرح جنت کا حصول اس کا مقصد نہیں رہتا اور نہ اس سے ملنے والی راحت کی وہ آرزو رکھتا ہے۔ اسے بہشت کی دائمی مسرت میں کوئی کشش نظر نہیں آتی، جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے، نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ جس کے بارے انسانی دماغ کی رسائی ممکن ہے۔ نہ اس کے سامنے رضائے الٰہی کا نصب العین ہوتا ہے جو کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ اسی لئے اس نے مسلمانوں کے درمیان امت کی حیثیت سے اسلامی اخوت کا باہمی رشتہ جو اس عقیدے سے پیدا ہوتا ہے کھو دیا۔ اس

طرح مسلمان مختلف ریاستوں، قبیلوں، برادریوں، مسلکوں اور جماعتوں میں تقسیم ہو گئے، ان کی حیثیت مختلف افراد کی ہو گئی ہے جو ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ان کے ذہنوں سے اسلامی عقیدے کی یہ تینوں چیزیں فراموش ہو گئی ہیں اسلئے وہ ایک بے جان فوجی دستہ بن کر رہ گئی ہے۔ جہاں تک بذاتِ خود اسلامی عقیدے کی بات ہے، یہ ایک ایک مسلم فرد کے اندر موجود ہے اور ہر ایک مسلمان صبح وشام کلمۂ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ضرور پڑھتا ہے یعنی اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اس کے باوجود بھی اس کلمہ سے نہ تو اس کے جسم کے کسی بال میں بھی ایک حرکت پیدا ہوتی ہے، نہ اس کے جذبات پر کوئی اثر دکھتا ہے نہ یہ چیز اسے زندگی میں ایک انچ بھی آگے بڑھاتی ہے اور نہ یہ چیز اسے زوال پذیر ہونے سے روک رہی ہے۔ اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں نے عقیدہ نہیں کھویا ہے بلکہ اس عقیدے سے جو چیز بر آمد ہوتی ہے، اس پر سے اس کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔

یہ کہنا سراسر گمراہی ہے کہ مسلمانوں کا مسئلہ ان کی مالی حالت سے جڑا ہے، اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ان کے زوال کی وجہ غربت ہے اور دولت سے امت کا احیاء ہو جائیگا، یہ بات بالکل غلط ہے۔ دولت سے نہ تو افراد کا احیاء ہوتا ہے اور نہ ہی امت کا، کیونکہ احیاء فکر کی بلندی (ارتفاعِ فکری) سے ہوتا ہے۔ صحیح احیاء روحانی بنیاد پر فکری بلندی ہے۔ جہاں افکار کا وجود ہو گا وہیں احیاء کا وجود ہو گا، جہاں افکار نہیں رہے وہاں زوال ناگزیر ہے۔ اس طرح کسی بھی قوم کے افکار وہ عظیم ترین دولت ہے جو وہ زندگی میں حاصل کر سکتی ہے خاص طور سے کوئی نئی قوم۔ اگر قوم قدیم ہے اور اس کے افکار کی

جڑیں گہری ہیں تو یہ دولت وہ عظیم ترین تحفہ ہے جو ایک نسل دوسری نسل کو دے سکتی ہے۔ اگر کسی قوم کی مادی دولت ختم ہو جائے، اُس کے لئے ممکن ہے کہ وہ جلد ہی اسے دوبارہ حاصل کر لے جب کہ وہ اپنی فکری دولت کو بچا کر رکھتی ہے۔ تاہم اگر اس کی فکری دولت ضائع ہو جائے اور قوم کے پاس صرف مادی دولت بچے تو یہ دولت بہت جلد ختم ہو جائے گی اور وہ غربت کی طرف لوٹ جائے گی۔ اگر اس امت کے تمام ذرائع و وسائل کو ایک ریاست میں جمع کر دیا جائے جو کہ تمام مسلمانوں پر اسلام فرض قرار دیتا ہے تو یہ حقیقت ہے کہ یہ امت امیر ترین نہیں تو دولت مند ترین قوموں میں سے ایک ضرور ہے۔ اس کے علاوہ اقتصادیات میں اضافے کیلئے نہ صرف یہ کہ اس کی زراعت کو بڑھایا جائے بلکہ زراعت و صنعت کو اس طرح ترقی دی جائے کہ اس میں صنعت کو نمایاں مقام حاصل رہے، اس کیلئے ترغیب پیدا کی جانا چاہئے جو امت کے اندر اپنی مالی حالت کو سدھارنے کیلئے تحریک پیدا کرے۔ یہ ترغیب سوائے فکر کے اور کسی چیز سے پیدا نہیں کی جا سکتی۔ عظیم ترین فکر ایک معقول (Rational) عقیدہ ہے جس سے زندگی کے متعلق افکار بر آمد ہوتے ہیں۔ اسلئے مسئلہ اقتصادی نہیں بلکہ عقلی ہے یعنی معاملہ افکار پر اعتماد کا ہے جو ان کے عقیدے سے نکلتے ہوں۔

یہ سوچ بھی بہت سطحی ہے کہ مسئلہ تعلیم اور سائنس (Science) کا ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ افکار نہیں بلکہ سائنس سے ترغیب ہوتی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ افکار سے ترغیب ہوتی ہے اور کسی چیز کا منضبط علم (Sciences)، ہر ترقی اور تنزل یا وجود و عدم وجود کے معاملے میں

افکار اثر انداز ہوتا ہے۔ افکار اور سائنس میں فرق یہ ہے کہ افکار چیزوں اور کاموں کے تعلق سے نقطۂ نظر کو کہتے ہیں تاکہ ان کی تعریف متعین کی جا سکے۔ جہاں تک سائنس کا تعلق ہے یہ بذاتِ خود چیزوں کے متعلق نقطۂ نظر کو کہتے ہیں تاکہ اس کا جوہری علم حاصل ہو سکے۔ جو چیز کہ زندگی کا رخ متعین کرتی ہے وہ افکار ہیں نہ کہ سائنس۔ کسی قوم کے سائنسی انکشافات اور ایجادات اگر ضائع بھی ہو جائیں تو وہ قوم اِن انکشافات اور ایجادات کو دوبارہ حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ اس قوم نے اپنے افکار اور سوچنے کا طریقہ ترک نہ کیا ہو۔ تاہم اگر وہ اپنا سوچنے کا طریقہ ہی چھوڑ دے یعنی اپنے افکار چھوڑ دے تو وہ پھر سے پسماندہ ہو جائے گی اور وہ تمام ایجادات اور انکشافات جو اس نے کئے ہیں کھو دے گی۔ اگرچہ امت مسلمہ کے پاس طلبہ اور تعلیم یافتہ افراد کی ایک کثیر تعداد ہے جن کی گنتی کروڑوں میں ہو گی پھر بھی یہ امت انکشافات اور ایجادات کے معاملے میں کتنی پسماندہ ہے کیونکہ اس کے پاس افکار نہیں ہیں جو اس تعلیم اور سائنس کو ایک مقصد کے حصول کی طرف رہنمائی کر سکیں اور عظیم ہدف کی طرف لے جا سکیں۔ اس کے علاوہ محققین وموجدین دنیا میں ہر جگہ ہیں جو ملازمتیں کر رہے ہیں۔ انہیں کسی بھی ملک سے لا کر ملازم رکھا جا سکتا ہے، مگر ان کو لانے یا اس طرح کی کسی چیز سے مسئلہ حل نہیں ہو گا جب تک کہ افکار نہ ہوں اس طرح یہ مسئلہ افکار کا ہی ہے۔

یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ مسئلہ قانون سازی اور قوانین کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ قوانین زندگی اور ریاست کی بنیاد ہیں، جو کہ فی الواقع صحیح نہیں ہیں، کیونکہ قوانین اور اصول تو روزمرہ کی زندگی کے مسائل کا صرف حل ہیں جو زندگی کے متعلق نقطۂ نظر سے برآمد ہوتے ہیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کا مسئلہ امت کی حیثیت سے یعنی امتِ مسلمہ کی حیثیت سے ہے۔ امتِ مسلمہ کا مسئلہ اسلامی عقیدہ پیدا کرنے سے، اقتصادی حالت مضبوط ہونے سے یا معیارِ تعلیم و ثقافت بلند کرنے سے حل نہیں ہو گا نہ یہ قانون سازی میں اصلاح کرنے یا اس کے نئے قوانین و دستور بنانے سے حل ہو گا، بلکہ اس کا حل تو قوانین و دستور کو عقیدے سے جوڑنے میں ہے۔ یہ قطعی ایمان و یقین پیدا کرنا ہے جو اس حقیقت کے مطابق امت میں موجود ہو اور جو افکار و احکام شریعت پر مرکوز ہوں، جو کتاب و سنت سے مستنبط ہوں اور جو بھی کتاب و سنت سے نشاندہی ہو اسے شرعی دلیل کے طور پر مانا جائے۔ دوسرے الفاظ میں معاملہ افکار و نظام میں اعتماد پیدا کرنے کا ہے جو اسلامی مبداء سے برآمد ہوتے ہوں۔ یہ ہے بالکل ٹھیک اور متعین حل۔

اب جہاں تک اس مسئلے کو حل کرنے کی بات ہے، تو ہمیں اسی مقام اور سطح پر واپس جانا پڑے گا جہاں سے غلطی کی شروعات ہوئی ہے تاکہ اس غلطی کی اصلاح بھی بنیادی سطح پر ہو سکے، اس کے علاوہ اور کوئی علاج ممکن نہیں ہے۔ موجودہ صورتِ حال کے باوجود مسلمان آج بھی مسلمان ہی ہے۔ ان کا عقیدہ ابھی تک اسلامی ہی ہے۔ اب بھی اسلام تو کتاب و سنت ہی ہے جیسا کہ وہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تھا۔ احکامِ شریعہ اب بھی وہی ہیں جو پہلی بار مستنبط کئے گئے تھے یعنی اموی اور عباسی دور میں۔ احکامِ شرعیہ استنباط کرنے کا طریقہ بھی وہی ہے جیسا اس وقت جب اصول فقہہ ترتیب دئے گئے تھے۔ مسلمانوں کے درمیان ان کے اسلام پر یقین میں کوئی کمی نہیں آئی اور نہ ہی اسلام میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ بلکہ ہوا یہ ہے کہ اسلامی عقیدے سے نکلے ہوئے افکار اور اصولوں پر سے ان کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں امت اور ریاست کا وجود ہی کمزور ہو گیا۔ یہ بات اسے ریاست کے خاتمے تک لے گئی اور امت تباہی کے راستے پر چلنے لگی یہاں تک کہ وہ زوال کے گڑھے پر پہنچ گئی اور اس کے وجود کو ہی خطرہ لاحق ہو گیا۔ اسلئے حل بھی اسی جگہ پر ملے گا جہاں سے غلطی کی شروعات ہوئی تھی یعنی اسلامی مبداء سے نکلے ہوئے افکار و قوانین پر اعتماد بحال کرنا۔ یہ وہ چوٹ تھی جس نے ریاست کو ختم کیا اور امت کو تقریباً برباد کر دیا۔ حل کا مقصد یہ ہے کہ امت کا احیاء ہو اور ریاست کو دوبارہ قائم کیا جائے تا کہ اسلامی طریقۂ زندگی دوبارہ عمل میں آئے اور ساری دنیا میں اسلام کی دعوت کو پہنچایا جائے۔ یہ ہے اصل معاملہ اور مسئلے کی جڑ۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے اعتماد کسی چیز کے صحیح اور سچ ہونے پر یقینِ کامل سے آتا ہے اور یقین جذبات سے پیدا ہوتا ہے اس طرح انسانوں میں یقین بغیر کسی ثبوت کے آتا ہے اور بغیر کسی ثبوت کے ختم بھی ہو جاتا ہے۔ اسلئے اعتماد کسی ثبوت یا منطق سے حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ یقینِ کامل پیدا کر کے حاصل ہوتا ہے جو اتفاقاً آتا ہے اور اتفاقاً اُٹھ بھی جاتا ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کسی چیز کے صحیح اور سچا ہونے پر یقین سے

اعتماد پیدا ہوتا ہے یعنی اس کے فطری اور حقیقت کے مطابق ہونے سے۔ تاہم یہ ثبوت کی بنیاد پر پیدا ہوتا ہے جو چیز کے سچا اور صحیح ہونے سے قائم ہوتا ہے۔ یہ ثبوت عقلی بھی ہو سکتا ہے جو جذبات سے جڑا ہو یعنی عقلی دلیل سے معاملے کا سچا اور صحیح ہونا ثابت ہو اور کوئی شخص واقعی میں اس کے صحیح اور سچے ہونے کو محسوس کرے، یا وہ بغیر کسی عقلی ثبوت کے اس کا صحیح اور سچا ہونا محسوس کر سکتا ہے، تاہم بار بار ایسا کرنے سے یقین حاصل ہو جاتا ہے اور اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح اعتماد نہ تو اتفاقاً آتا ہے اور نہ اتفاقاً اُٹھ جاتا ہے بلکہ یہ عقلی اور شعوری طور پر یا جذباتی طور پر فکر کے بار بار فطری اور حقیقت کے مطابق ثابت ہونے سے آتا ہے یعنی چیز کے بار بار ثابت ہونے پر، بالکل اِسی طرح وہ اعتماد فکر کے بار بار غلط یا جھوٹ ثابت ہونے سے ختم بھی ہو جاتا ہے۔ اسی طریقہ کار (Mechanism) سے یقین پیدا ہوتا ہے اور اسی سے متزلزل بھی ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اعتماد پیدا ہونے سے پہلے اپنے اندرونی دلائل سے معاملے کا صحیح اور سچا ثابت ہونا ضروری ہے۔ ایسا عقلی طور پر اور جذبات کے ذریعہ اس کا صحیح اور سچا ثابت ہونے سے ہوتا ہے۔ بالکل جس طرح خاص طور سے شک کے ماحول میں اعتماد پیدا ہونا مشکل ہے اسی طرح خاص طور سے ایمان کے ماحول میں اعتماد کا مجروح ہونا مشکل ہے۔ جب ایمان کا ماحول تھا اس وقت مغربی کفار کیلئے جدید زمانے کے مسائل کو حل کرنے میں اسلامی شریعت کی صلاحیت پر اعتماد کو مجروح کرنا مشکل تھا۔ اسی طرح آج ان لوگوں کیلئے جو شک کے اس ماحول میں اسلام کیلئے کام

کر رہے ہیں، اسلام کی موزونیت پر اعتماد بحال کرنا آسان نہیں یعنی زندگی کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر پر مضبوطی سے جمنا جو کہ اصل اسلامی عقیدہ ہے۔

اسلامی افکار اور اسلامی احکامات کے صحیح اور سچا ہونے کیلئے عقلی اور جذباتی ثبوت کے بغیر مسلمانوں اور دوسرے لوگوں کے ذہنوں میں اعتماد پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسلئے ریاست کے قیام، امت کے احیاء اور اعتماد کی بحالی کی طرف پہلا قدم روز مرہ کے واقعات اور اور موجودہ مسائل کے حل کے تعلق سے اسلامی افکار اور احساسات کے صحیح اور موزوں ہونے کی عکاسی ہونا چاہئے۔ اس سے عقلی اور جذباتی ثبوت مہیا ہو گا جس سے اس کے سچا اور صحیح ہونے پر یقین پیدا ہو گا اور اس کے نتیجے میں اعتماد بحال ہو گا۔ جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ ان واقعات سے اس کی عکاسی کیسے ہو گی، یہ کام سیاسی طریقے سے اسلام کی دعوت دینے سے ہو گا، اسلامی افکار کے ذریعہ اسلامی ریاست کے قیام کیلئے کام کرنے سے یہ ہو پائے گا، اس کے اندر ایک حقیقت ہے، لوگوں کے باہمی تعلق کی بنیاد بھی یہی ہو گی، ان کے افکار زندگی کے مسائل سے جڑے ہوں یا باہمی تعلقات اسی بنیاد پر منظم ہوں۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی خلافت کے قیام کا کام بڑے پیمانے پر اسلامی افکار کو عام کرنے اور اسی راستے پر سیاسی جدوجہد کرنے سے ہو گا۔

ایسا اسلئے ہوتا ہے کیونکہ لوگوں پر موجودہ اقتدار کے ذریعہ حکومت کی جاتی ہے، اس حکومت پر یا تو آپس کے ہی لوگ قابض ہو جاتے ہیں یا یہ کسی دوسرے حکمراں سے اسے چھینتے ہیں۔ یہ حکمراں

اپنے شہریوں کے مسائل کو متعین افکار و قوانین کے ذریعہ حل کرتے ہیں، متعین واقعات کو سامنے رکھ کر متعین افکار کے ذریعہ لوگوں کے معاملات کو نمٹایا جاتا ہے۔ یعنی متعین مسائل کے متعین حل ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ واقعات اور مسائل واضح اور شعوری ہوتے ہیں اور ان کے حل بھی واضح اور شعوری ہوتے ہیں اور ان کے نتائج بھی مفادات کے تحفظ کے معانی میں شعوری ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو اس نظام کو تباہ کر کے اسلامی ریاست کے قیام کیلئے کوشاں ہیں، ان کیلئے ضروری ہے کہ وہ اُن کے ذریعہ پیش کئے گئے حل کی خرابیوں کی طرف عوام کو توجہ دلائیں یعنی وہ عوام کے سامنے ان افکار و قوانین کا غلط ہونا ثابت کریں جن سے یہ ان کے مسائل کو حل کر رہے ہیں۔ ان کو یہ بھی بتانا ہے کہ ان مسائل کا حل مخصوص افکار اور مخصوص قوانین کے ذریعہ ہی ممکن ہے یعنی اسلامی افکار اور شرعی قوانین کے ذریعہ، اور ان قوانین کا موجودہ مسائل پر انطباق ہونا چاہئے۔ اس طرح حکومت کی حقیقت کو سمجھا جاتا ہے اور اس کے معانی سمجھ میں آتے ہیں، اس سے عوام سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ان کے جذبات اس سے وابستہ ہونے لگتے ہیں۔ جہاں تک ان افکار و قوانین کو غلط ثابت کرنے کی بات ہے جن کے ذریعہ یہ عوام کے مسائل حل کر رہے ہیں، ان کے بارے میں اس طرح بتانا صحیح نہیں ہے کہ ان سے لوگوں کو فائدہ ہو گا یا نقصان بلکہ اس بات کی اچھی طرح وضاحت ہونا چاہئے کہ یہ کافرانہ افکار و قوانین ہیں۔ ان کے بارے میں اس طرح کا اظہار صحیح نہیں ہے کہ ان افکار و قوانین کو اختیار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے یا ان سے نقصان ہوتا ہے، بلکہ ان کا غلط ہونا اس بنیاد پر ہونا چاہئے اور یہ بتانا چاہئے کہ یہ غیر

اسلامی اور کافرانہ قوانین ہیں اوران کے ذریعہ کرایا گیا فیصلہ طاغوت کا فیصلہ ہو گا۔ ان کا غلط ہونا اس طرح ظاہر ہونا چاہئے کہ یہ افکار و قوانین کافرانہ ہیں اور یہ معاملہ کفر اور اسلام کا ہے نہ کہ فائدے اور نقصان کا۔ اسی طرح ان مسائل کا صحیح حل بتاتے وقت یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ اسلامی افکار و قوانین ہیں، اس معانی میں ان کو نہیں سمجھنا چاہئے کہ ان کو اختیار کرنے سے فائدہ ہو گا یا انہیں چھوڑنے سے نقصان، اس لحاظ سے ان کی موزونیت زیر بحث نہیں ہے اس کے بجائے ان کا صحیح اور سچا ہونا اور ان کی موزونیت ان معانی میں بتانا چاہئے کہ یہ حکم شرعی ہے اور اس کی شرعی دلیل کتاب و سنت سے دینا چاہئے یا ان اصولوں سے جن کا استنباط کتاب و سنت سے کیا گیا ہو یا ان کی فروع سے اور حکم شرعی کے معاملات سے جن کے دلائل عام معلومات میں ہوں۔

یہ وہ طریقہ ہے جس سے حکمرانوں کے ذریعہ مسائل کے حل کو غلط ثابت کیا جائے اور اس کے مقابلہ میں اسلامی افکار و قوانین کے ذریعہ صحیح حل پیش کیا جائے، اس طرح موجودہ مسائل کے حل کو براہ راست اسلامی مبداء سے جوڑا جائے۔ اسی طرح اسلامی مبداء کو اس طرح لیا جانا چاہئے کہ صرف یہی بنیاد ہے جس کو سامنے رکھ کر ان افکار و قوانین کو دیکھا جائے گا۔ ان کو صرف اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے گا اور کسی طرح نہیں۔ دنیا میں جو بھی قوانین ہیں یا تو اسلامی ہیں یا کافرانہ، ان کی کوئی تیسری قسم نہیں ہے۔ اسلئے افکار و قوانین کا رد یا قبول کیا جانا صرف اسی بنیاد پر ہونا چاہئے یعنی اسلام یا کفر، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پوری دنیا میں یا تو دار الاسلام ہے یا دار الکفر، اس کے علاوہ کوئی تیسری قسم نہیں۔ اسلئے ہم کو کسی بھی فکر یا قانون کے

بارے میں اگر وہ کافرانہ ہے تو اسے کفر کہنا چاہئے اور اگر وہ حرام ہے تو اسے حرام کہنا چاہئے اور شرعی دلیل سے یہ بتایا جانا چاہئے کہ یہ حرام یا کفر ہے۔ لوگوں کے سامنے اس کی وضاحت ہونا چاہئے کہ جو بھی غیر اسلامی افکار و قوانین کو اختیار کرتا ہے وہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اسلئے کوئی بھی فکر یا قانون ایمان باللہ کے حکم سے ٹکراتے ہوں تو یہ کفر یا ارتداد کا ارتکاب ہو گا، مثلاً ریاست کو دین سے علیحدہ کرنا (Secularism) یا کسی مندر یا چرچ کی امارت کیلئے چندہ دینا، جو بھی اس گناہ کا مرتکب ہو گا اسے دوزخ میں سزا ملے گی۔ اسی طرح ہر وہ فکر یا قانون جو اللہ کے احکامات میں سے ہو جس کا تعلق اعمال سے ہو نہ کہ ایمان سے، مثال کے طور پر عقیدۂ قوم پرستی یا بینک سے سودی قرض لینا۔ اس طرح افکار و احکامات کی بنیاد اسلامی مبداء ہونا چاہئے اور اس کی کسوٹی اسلام، کفر، حلال اور حرام ہونا چاہئے۔ ان کا غلط یا صحیح ہونا اسی بنیاد پر جانچا جائے گا اور انہی کسوٹیوں سے اُنہیں پرکھا جائے گا۔

جب مسائل کے موجودہ حل کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے تو یہ اس غرض سے کیا جاتا ہے کہ معاشرے کی یعنی لوگوں کے باہمی تعلق کی موجودہ خرابیوں کو اجاگر کیا جائے۔ ان کی خرابیاں اس سے پیدا نہیں ہوتیں کہ یہ فائدہ یا نقصان کو سمجھنے لگیں، یعنی ان خرابیوں کو جانچنے کی کسوٹی لوگوں کا فائدہ یا نقصان نہیں ہے۔ اس کے بجائے زندگی کے متعلق غلط نقطۂ نظر کے نتیجے میں یہ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، یہ نقطۂ نظر ہی ان رشتوں کو منضبط کرتا ہے اور اسی سے اس کے حل بر آمد ہوتے ہیں اسی لئے مسائل کے حل کو ان کی بنیاد سے جوڑنا چاہئے اور ان کی خامیوں کو ان کی بنیاد کی غلطی

کے معنوں میں واضح کرنا چاہیئے نہ کہ اس معنی میں کہ اس سے فائدہ ہو گا یا نقصان۔ اس طرح یہ ناگزیر ہے کہ حل کو اس عقیدے سے جوڑا جائے جس سے یہ نکلتے ہیں۔ یہ حل اِن معنوں میں چیلنج کئے جائیں کہ یہ غلط عقیدے سے بر آمد ہوئے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ان کو کافرانہ افکار و قوانین کی حیثیت سے چیلنج کیا جائے قطع نظر اس سے کہ ان سے فائدہ ہوتا ہے یا نہیں۔ اسلئے یہ لازمی ہے کہ لوگوں کے موجودہ باہمی روابط و رشتوں کو اس بنیاد پر چیلنج کیا جائے اور اس نظر سے اُنہیں دیکھا جائے کہ یہ رشتے کافرانہ افکار و قوانین کی بنیاد پر قائم ہیں اور چیلنج کو اسی بنیاد پر مرکوز ہونا چاہیئے، کیونکہ ان کو چیلنج کرنے کا مقصد اس موجودہ معاشرے کو غیر اسلامی معاشرہ ہونے کی وجہ سے بدلنا ہے اور موجودہ افکار و قوانین کو کافرانہ افکار و قوانین ہونے کی وجہ سے مٹانا ہے۔ یہ اسلئے کرنا ہے تاکہ اسلامی معاشرہ قائم کیا جا سکے اور لوگوں کے موجودہ تعلقات میں اسلامی افکار و قوانین جاری و ساری ہو سکیں۔ اس طرح ہمارا مقصد موجودہ زندگی کے تعلق سے اسلامی نقطۂ نظر پیدا کرنا ہے تاکہ لوگوں کا طریقۂ زندگی اسلام کے مطابق ڈھل جائے چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ یہ مقصد نقصان و فائدے بتا کر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صرف اسلامی عقیدے کو اسلامی زندگی کی خالص بنیاد بنا کر اور حلال و حرام کو اپنے اعمال کی کسوٹی بنا کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اسلئے مسئلہ اسلامی افکار و احکام پر اعتماد کی بحالی کا ہے، جو بحیثیت اسلامی افکار و احکام کے کتاب و سنت سے مستنبط ہوں یا ان کے لئے کتاب و سنت سے دلیل کے طور پر رہنمائی حاصل کی گئی ہو۔ یہاں معاملہ فائدے یا نقصان کی بنیاد پر اسلامی افکار و احکام پر اعتماد کی بحالی کا نہیں ہے۔ اس

وقت موجودہ روابط پر حملہ کرنے کیلئے براہ راست قدم اٹھانے کی ضرورت ہے جن کا نتیجہ فریب اور دیگر خرابیاں ہیں اس نقطۂ نظر کا جس سے معاشرے کے رشتے بنتے ہیں۔ اسلئے موجودہ رشتوں کے خلاف حملہ ضروری ہے یعنی ان افکار و قوانین کے خلاف حملہ جن سے حکمراں لوگوں کے معاملات کو نمٹاتے اور ان کے مسائل کو حل کرتے ہیں۔ ان پر اس حیثیت سے حملہ کرنا چاہئے کہ یہ کافرانہ افکار و قوانین ہیں اور ان پر اسلامی افکار و قوانین سے بحیثیت اسلامی افکار و قوانین کے ہی حملہ کرنا چاہئے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ ان افکار و قوانین کے درمیان ایک سخت معرکہ آرائی ہوگی۔ یہ فکری معرکہ آرائی ہوگی جس سے دل و دماغ کے اندر ذہنی اور جذباتی تکرار ہوگی جس سے ایسی شعائیں نکلیں گی اور ان سے سچائی کی ایسی روشنی نمودار ہوگی جس کی چمک سے موجودہ افکار و جذبات کی خرابیاں نمایاں ہو جائیں گی، ہمیں یہ بتانا ہے کہ یہ خرابیاں اس نقطہ نظر کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ ایسی فکری معرکہ آرائی میں مسلمان کافرانہ عقائد اور ان کافرانہ نقطہ نظر کے فریب و خامیاں محسوس کریں گے اور کفار بھی اپنے نقطہ نظر کی خرابی اور اسلامی نقطہ نظر کی سچائی اور برتری کو محسوس کر پائیں گے۔ یہ بات واضح ہونے کے بعد موجودہ اقتدار کی خرابیاں اور اسلامی حکومت کی اچھائیاں لوگ خود محسوس کریں گے۔ روز مرہ کے واقعات اور موجودہ حالات سے اسلامی افکار و احکام کے صحیح اور سچا ہونے کی عکاسی ہوگی اور اُن پر یقین پختہ ہوگا۔ اس یقین سے دنیا میں موجود تمام افکار و قوانین کے مقابلے میں تنہا اسلامی افکار و احکام پر اعتماد پیدا ہوگا۔ جب عام لوگوں میں یہ یقین پیدا ہو جائے گا اور ذہن اس پر اعتماد سے بھر جائیں گے اور اس

عام بیداری سے رائے عامہ تیار ہو گی تب بغیر کسی شک و شبہ کے امت کا احیاء ہو گا اور وہ ایک ریاست کو قائم کرنے میں کامیاب ہو گی چاہے اس کے راستے میں کتنی ہی رکاوٹیں آئیں۔ کیونکہ دھما کہ خیز اور متحرک کرنے والے افکار مضبوط سے مضبوط سیاسی قوت کو بہا کر لے جاتے ہیں اور ہر غلط فکر اور ہر بد عنوان حکومت کو تباہ کر دیتے ہیں۔ یہ ہے وہ طریقہ جس سے حالات، مسائل اور واقعات کے ذریعہ اسلامی افکار و احکام کے صحیح اور سچا ہونے کی عکاسی ہو گی۔ اسلامی سیاست کو بنیاد بنا کر اور اسلامی افکار و قوانین کو زیادہ سے زیادہ لوگوں میں پھیلا کر ہمیں سیاسی جدوجہد کرنی ہو گی۔ دوسرے الفاظ میں ہمیں اسلام کی دعوت سیاسی طریقے سے دینا ہو گی۔ اس کا نتیجہ ہم سمجھتے ہیں کہ کافروں نے اپنے مسلم ایجنٹوں کے ذریعہ مسلمانوں کو سیاست سے دور کرنے کی مہم چلا رکھی ہے تاکہ یہ کہہ کر مسلمانوں کو سیاست سے دور رکھا جائے کہ سیاست اسلام کے مزاج اور اس کی روح کے خلاف ہے۔ ہم اسلامی تحریکوں کے خلاف کفار ریاستوں کی طرف سے چھیڑی گئی اس جنگ کے راز کو بھی سمجھتے ہیں جو وہ اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ لڑ رہے ہیں۔ صرف یہی وہ جماعتیں ہیں جو ریاست کو قائم کریں گی اور جن سے امت کا احیاء ہو گا، یہی کفار پر حملہ آور ہوں گی جو اسلام کی شان کو واپس لائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ کفار نے ان اسلامی تحریکوں کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی ہے اور وہ مسلمانوں کو سیاست سے دور کر رہے ہیں۔ اس وقت تک امت کا اعتماد بحال نہیں ہو سکتا، اسلامی امت کا احیاء نہیں ہو سکتا، اسلامی خلافت قائم نہیں ہو سکتی اور اسلامی ریاست دوبارہ وجود میں نہیں آسکتی جب تک کہ ہم اسلام کی بنیاد پر سیاسی جدوجہد نہ کریں۔

اسلئے اگر امت کو تباہی سے بچانا ہے تو اس میں اسلامی افکار و قوانین کے صحیح اور سچا ہونے اور ان کے موزوں ترین ہونے کے تعلق سے اعتماد پیدا کرنا پڑے گا۔ یہ اس طرح ہو گا کہ واقعات کے ذریعہ اس کے صحیح اور سچا ہونے کی عکاسی ہو جس کے نتیجے میں مکمل یقین پیدا ہو گا۔ دوسرے الفاظ میں یہ سیاسی طریقے سے اسلامی دعوت دینے سے ہی ہو گا یعنی اسلامی افکار کو بڑے پیانے پر عام کرنے سے، اس مقصد کیلئے جد و جہد کرنے اور اسلامی خلافت کو دوبارہ قائم سے ہو گا۔ یہ وہ راستہ ہے جس پر چل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک امت تیار کی اور ایک اسلامی ریاست قائم کی۔ اس حقیقت کے علاوہ یہ ایک قابلِ محسوس سچائی ہے جو کسی شخص کو کسی بھی دوسرے راستے کے مقابلے میں اس راستے کی طرف راغب کرتی ہے، یہ ایک حکمِ شرعی ہے جس سے مسلمانوں کو چمٹ جانا چاہیۓ، اسی راستے پر ان کو لگ جانا چاہیۓ اور دوسرے تمام راستوں سے اجتناب کرنا چاہیۓ۔ ان تمام باتوں سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کیلئے صرف یہی راستہ ہے جس پر ان کو چلنا ہے۔ اس طرح آج مسلمانوں کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ کوئی بھی دوسرا کام کرنے سے پہلے اسلامی ریاست کو قائم کرنے کیلئے جد و جہد کریں یعنی اسلامی خلافت کو دوبارہ قائم کرنے کا کام۔ ذہنی اور سیاسی انقلاب کے ذریعہ ہی یہ کام ہو گا جس سے فاسد افکار کا خاتمہ ہو گا اور بد عنوان حکومتیں تباہ ہوں گی۔

اس سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے: عالمِ اسلام میں اِن اسلامی افکار کا کیا اثر ہو گا جب کہ اُس کے ہر حصے پر کفر چھایا ہوا ہے؟ انفرادی سطح پر کافرانہ قوانین چل رہے ہیں اور اسلامی دنیا میں ملکوں

کے باہمی تعلقات اور ان کے شہریوں کے تعلقات کافرانہ قوانین کی بنیاد پر ہی قائم ہیں۔ مسلمانوں کے اذہان اوراحساسات پر کافرانہ افکار چھائے ہوئے ہیں۔ اسلامی افکار سے کیا حاصل ہو گا جبکہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر کفر نافذ ہے، قران کے نسخوں، مسجدوں اور مسلمانوں کی ایک قلیل تعداد کے علاوہ اسلام کا کہیں وجود نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دنیا کا کوئی سا بھی معاشرہ دو موٹی دیواروں کے اندر رہتا ہے، یہ دیواریں بیرونی افکار و جذبات کے نفوذ سے اس معاشرے کو تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ پہلی دیوار باہری ہے جو بنیادی عقیدے کی دیوار ہے، یعنی کائنات، انسان اور حیات کے تعلق سے ایک ہمہ گیر فکر کہ اس دنیوی زندگی سے پہلے کیا ہے اوراس کے بعد کیا ہو گا؟ اور اس زندگی کا دنیوی زندگی سے پہلے اور دنیوی زندگی کے بعد سے کیا تعلق ہے۔ دوسری دیوار ان نظاموں کی ہے جو لوگوں کو ایک رشتے میں باندھتے ہیں اور ان کو ایک نظام زندگی دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس معاشرے کو اس کے ہی لوگوں کے ذریعہ تبدیل کرنا چاہتا ہے اور اسے جڑ سے ہی بدلنا چاہتا ہے تو اس کو پہلے بیرونی دیوار پر نئے عقیدے سے وار کرنا ہو گا اور یہ وار اندرونی دیوار پر حملے سے جڑا ہو گا۔ تاہم اندرونی دیوار پر حملے کی بنیاد بھی وہی افکار ہوں گے جن سے بیرونی دیوار پر حملہ کیا گیا تھا۔ اس وار سے جدید اور قدیم افکار کے درمیان ایک ذہنی تصادم شروع ہو گا۔ یہ سیاسی معرکہ آرائی بیرونی دیوار کے منہدم ہونے تک جاری رہے گی۔ باہری دیوار کے گرنے کے بعد اندرونی دیوار بھی بچ نہیں پائے گی اور اس طرح ذہنی اور جذباتی انقلاب برپا ہو جائے گا۔ پس یہ سیاسی انقلاب ہو گا یعنی پورا معاشرہ تبدیل ہو جائے گا اور

حکومت اور باقی رشتے بھی بدل جائیں گے۔ یہ اُسی طرح کی کوشش ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے کے معاشرے میں کی تھی اور مدینے کے معاشرے میں اُنہوں نے اس سلسلے میں کامیابی حاصل کی۔ ایسے معاشرے کو بدلنے کیلئے فکری اور مادی قوت کی ضرورت پڑتی ہے۔ جہاں تک آج اسلامی ممالک کے معاشرے کا سوال ہے، اس کی صرف ایک ہی دیوار ہے جو کہ اندرونی دیوار ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ فکری حملے سے پوری دیوار کو ہی منہدم کیا جائے، بلکہ اقتدار حاصل کرنے کیلئے اس میں صرف سوراخ ہی کافی ہو گا۔ اگر اسے بیرونی دیوار کا تحفظ حاصل نہیں ہے تو یہ اندر سے ہی ایک انقلابی دھماکے سے زمین دوز ہو جائے گی، کیونکہ اصل مسئلہ باہری دیوار کو گرانے کا ہے اور معاشرے میں داخل ہونا اس بیرونی دیوار کو منہدم کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تاہم اسلامی معاشرے میں کام کرنا ہمارے لئے نسبتاً آسان ہے کیونکہ بیرونی دیوار کی غیر موجودگی میں صرف اندرونی دیوار پر ہی وار درکار ہے۔ اسی لئے اس کے علاوہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے کہ ان افکار و قوانین پر حملہ کیا جائے جن پر اندرونی دیوار قائم ہے اور اسلامی افکار و احکامات کی وضاحت کی جائے جو کہ بذاتِ خود امّت کا عقیدہ ہیں، ان پر تو بس دوبارہ امت کا اعتماد بحال کرنا ہے، تب شروعات کرنا اور معاشرے کو دوبارہ بنانا آسان ہو جائے گا۔ ہمارا کام کافرانہ معاشرے میں اسلامی افکار کو پھیلانا نہیں ہے بلکہ غیر اسلامی معاشرے کے مسلمانوں میں اسلامی افکار عام کرنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں مسئلہ کفار کو دعوت دینے اور اسلام سے مطمئن کرانے کا نہیں ہے بلکہ یہ تو مسلمانوں کو اسلام کا ساتھ دینے اور اسلام کیلئے کام کرنے کی دعوت

دینے کا ہے جو اسلامی افکار کو پھیلانے اور اس راستے میں جدوجہد کرنے کا ہے۔ اگرچہ یہ سخت و مشکل کام ہے، لیکن صرف یہی نتیجہ خیز کام ہے اور کافرانہ معاشرے میں کام کرنے کے مقابلے میں یہ پھر بھی بہت آسان ہے۔

تاہم یہ ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارے دشمن کفار ہمیں کسی طرح بھی اسلامی ریاست کے قیام اور امت کے احیاء کیلئے کام نہیں کرنے دیں گے۔ وہ ہمیں اجازت نہیں دیں گے کہ ہم اسلامی افکار و قوانین کے صحیح اور سچے ہونے اور اُن کے موزوں ترین ہونے کے تعلق سے لوگوں میں اعتماد پیدا کریں۔ وہ اس کے لئے رکاوٹیں کھڑی کریں گے اور مختلف طریقوں اور ذرائع سے اس کام سے روکنے کی کوشش کریں گے۔ وہ اسلامی افکار و قوانین سے امتِ مسلمہ کا اعتماد ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے جب تک کہ اُنہوں نے اُن کی ریاست کو تباہ نہیں کر دیا اور اسے پوری طرح دبا نہیں دیا۔ اُنہوں نے اسلامی ریاست کو تباہ کر کے مسلمانوں کو شکستِ فاش دی اور اس کو ذلت کے راستے پر ڈال دیا، یہاں تک کہ وہ تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی۔ اب کیا یہ لوگ اس کی اجازت دیں گے کہ امتِ مسلمہ اپنے کھوئے ہوئے مقام پر واپس آئے جہاں کہ وہ اسلامی خلافت قائم کرے اور وہ اسلام کے پرچم تلے آجائے تاکہ وہ اپنی رسالت کی ذمہ داری کو دنیا کے لوگوں تک اسلام کی دعوت کو پہنچا کر ادا کرسکے۔ یہ لوگ ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیں گے بلکہ یہ اسکے خلاف جنگ چھیڑ دیں گے، اسلئے یہ کام اُن کی مرضی کے خلاف جا کر ہی کرنا پڑے گا، اس مقصد کی خاطر ان اسلام دشمنوں اور ان کے ایجنٹوں کے خلاف سخت جدوجہد کرنا ہوگی اور اس کے لئے

رائے عامہ تیار کرنا ہو گی اور عوام کو بیدار کرنا ہو گا، مسلمانوں کی یہ بیداری ان کفار کو اسلام کے راستے سے ہٹا دے گی۔ اسلئے دقت افکار کو مسلمانوں تک پہنچانے میں نہیں ہے جس سے امت کا احیاء ہو سکے اور ریاست وجود میں آ سکے بلکہ دقّت اس ثابت قدمی کی کمی کی ہے جو اسلامی افکار کو پھیلانے میں کفار و منافقین کے خلاف جدوجہد کیلئے مطلوب ہے۔

کافر ممالک جو اسلامی ریاست اور اسلامی حکومت کو دیکھ چکے ہیں خاص طور سے انگریز، فرانسیسی اور روسی، یہ ہم سے ضرور لڑیں گے کیونکہ یہ اسلامی امت میں اسلامی عقیدے کی قوت کو بھگت چکے ہیں اور اُنہیں اسلامی ریاست اور اس کی طاقت کا بخوبی اندازہ ہے جس سے اسلام کے تحفظ اور اس کی تبلیغ کی خاطر جہاد شروع ہو جائے گا۔ وہ کئی صدیوں تک اسلامی ریاست کی قائدانہ حیثیت کو دیکھ چکے ہیں اور وہ اسلامی افکار کی قوت اور مسلمانوں کی تلوار کا مزہ چکھ چکے ہیں۔ اسلئے اسلام کا صرف ذکر ہی اُنہیں خوف زدہ کر دیتا ہے اور وہ اسلامی خلافت کے دوبارہ قیام اور امتِ مسلمہ کے احیاء کے تصور سے ہی کانپ جاتے ہیں۔ آج کافر ریاستیں خاص طور سے انگریز، فرانسیسی، امریکن اور روسی اسلام کی طاقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ جب اس امت کا احیاء ہو جائے گا اور ان کی ریاست دوبارہ وجود میں آ جائے گی تو اُس وقت نہ تو کوئی ملک اس کو چیلنج کر پائے گا اور نہ کوئی عقیدہ اسلام کے سامنے ٹک پائے گا۔ اس کشمکش اور ذہنی ارتقاء کے عمل کے نتیجے میں، ایک طرف بوسیدہ سرمایہ دارانہ نظام تباہ ہو جائے گا، اور دوسری طرف مہمل ملحدانہ کمیونزم صرف ایک ملبے کا ڈھیر، کیونکہ اِن کا مقابلہ اسلام کے مضبوط افکار اور انسانی مسائل کو حل کرنے والے احکام سے ہو گا جن

کی ایک روحانی بنیاد اور طاقت ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس عالمی منظر نامہ میں قائدانہ ملک کی حیثیت سے اسلامی ریاست کی واپسی کوئی بھی کافر گوارہ نہیں کرے گا۔ اسی لئے وہ اپنی پوری نفرت کے ساتھ اس کا بھرپور مقابلہ کریں گے۔ اسلئے ہمیں کفار کے نئے نئے اندازوں اور چالوں سے ہوشیار رہنا چاہئے اور دشمن سے مقابلہ کرنے میں جن مشکلات کا ہمیں سامنا کرنا پڑے گا ان سے اچھی طرح واقف ہونا چاہئے۔ اسلامی افکار کو عام کرتے وقت ہمیں اپنے دشمنوں، اسلام کے دشمنوں کفار و منافقین سے ہوشیار رہنا ہو گا۔

برطانیہ اور روس دونوں جرمن فوج کی مصیبت کو جھیل چکے ہیں اسلئے باوجود ان کی قدروں میں تضاد کے، یہ اس بات پر متفق ہیں کہ جرمنی کو منقسم اور کمزور رکھیں اور اس کی طاقت حاصل کرنے کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کریں اور وہ ہر ایسے اقدام کی مخالفت کرتے ہیں جس سے جرمنی مضبوط ہو، تاکہ جرمن فوج دوبارہ طاقت کی اس سطح پر واپس نہ آسکے جو کہ اُن کے لئے خطرہ ہو گی۔ امریکہ اور انگلینڈ اپنے عقیدے کیلئے سوویت یونین کو بھی ایک خطرہ سمجھتے ہیں۔ اسی لئے وہ روس اور اس کے عقیدے سے مقابلہ آرائی میں ہر طرح کی چالیں چل رہے ہیں، امریکہ کا خیال یہ ہے کہ اس کے شہری محفوظ نہیں رہ سکتے جب تک کہ سوویت یونین کو دنیا کے نقشہ سے مٹا نہ دیا جائے اور کمیونزم کو ختم نہ کر دیا جائے۔ جرمنی اور روس کے ساتھ اتنی دشمنی ہونے کے باوجود مغربی ممالک کی اسلام سے دشمنی کہیں بڑھ کر ہے، کیونکہ روس اور جرمنی سے یہ نفرت نئی ہے جب کہ اسلام کے خلاف نفرت تاریخی اور روایتی ہے اور یہ ان کے افکار اور جذبات کی گہرائیوں

میں رچی بسی ہے۔ اسی لئے انہوں نے سرزمینِ اسلام کو مختلف ملکوں اور قوموں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ انہوں نے عرب کو مختلف ریاستوں میں بانٹ رکھا ہے تاکہ وہ مختلف قومیتوں کی شکل میں منقسم رہیں۔ وہ اسلام کے خلاف ذہنی اور سیاسی سطح پر مسلسل لڑتے رہے ہیں جبکہ اسلام کے خلاف نفرت کو انہوں نے چھپائے رکھا۔ یہ سب انہوں نے اسلئے کیا کہ اسلامی امت کا احیاء نہ ہو سکے اور اسلامی ریاست کی واپسی کو روکا جاسکے۔ یہ بات مسلمانوں کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے اور اس کا اظہار بھی ہونا چاہئے کیونکہ یہی ہمارے زوال کی انتہاء کا سبب ہے اسی سے ہم خلافت جیسی نعمت سے محروم ہوئے۔ اسی نعمت کے نہ ہونے سے آج مسلمان مکمل اسلامی زندگی سے محروم ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کیلئے پسند کی ہے۔

ہمارے دشمن نے ہماری اس نفرت کو جو ایمان اور کفر کی وجہ سے ہونا چاہئے، استعمار اور شہنشاہیت سے دشمنی میں بدل دیا۔ اس سے اصل مسئلہ ہی تبدیل ہو گیا یعنی مسلمانوں کی کفار سے دشمنی کے بجائے، اب استعمار اور مستعمر کے درمیان دشمنی کا مسئلہ بن گیا اور ہماری نفرت کی بنیاد مسلم اور کافر کے بجائے ایک قوم پرست کی نفرت ہو گئی جو اسے اپنے ملک پر قابض ایک غیر ملکی سے ہوتی ہے۔ اس طریقے سے انہوں نے اس کڑواہٹ کو ختم کر دیا جو بحیثیت مسلمان کے شکست کھانے سے ہمارے اندر پیدا ہوئی تھی اور اس حقیقت کو ہم سمجھ نہیں پارہے کہ یہ کفر کے ذریعہ اسلام کی شکست تھی۔ یہ اسلئے کیا گیا کہ اُن کے خلاف ہماری جدوجہد جہاد و قتال سے ہٹ کر، جس میں ہم اللہ کی رضا اور جنت کے حصول کیلئے لڑتے ہیں، ایک فرسودہ جدوجہد میں بدل جائے تاکہ یہ

آزادی کے حصول کیلئے مظاہروں اور احتجاجات تک محدود ہو کر رہ جائے۔ یعنی ہم اپنے آپ کو باقی عالمِ اسلام سے علیحدہ کر لیں۔ اسلئے ہم کو چاہئے کہ ہم اپنی جدوجہد کو واپس اُسی جگہ پر لے جائیں یعنی اصلی میدان میں۔ اسلام اور کفر کے درمیان جدوجہد میں جو کفار اور مسلمانوں کے درمیان ہوتی ہے، یہ جدوجہد ہمارے اور ان کے درمیان ہے، بات صرف اتنی نہیں ہے کہ وہ استعمار ہیں بلکہ وہ کافر اور استعمار ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ کفار ہیں اور ان سے لڑائی کی وجہ ان کا کفر ہے۔ اسلئے ہم کو یہ جاننا چاہئے کہ ہمارا دشمن کون ہے اور دشمن کی حیثیت سے ہی اس سے معاملہ کرنا چاہئے۔ اگر ہم یہ نہیں جانیں گے کہ ہمارے درمیان دشمنی کی اصل وجہ کیا ہے اور وہ کیوں ہمارے خلاف ہمیشہ دشمنی پر آمادہ رہتے ہیں، تو ہم اپنے آپ کو اُن کی حرکتوں اور سازشوں سے بچا نہیں پائیں گے اور نتیجتاً ہم ان سازشوں کا علاج بھی نہیں کر پائیں گے۔ اگر ہم ان کے ساتھ بحیثیت دشمن کے معاملہ نہیں کر پاتے تو بغیر کسی شک و شبہ کے، ہم انکے ماتحت اور انکے رحم و کرم پر رہیں گے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾

"یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے، پس تم اسے دشمن ہی سمجھو"۔ (سورہ فاطر: 35:6)

قرآن اپنی واضح آیات سے ہمیں بتا رہا ہے کہ ہمیں اِن لوگوں سے کس طرح کا معاملہ رکھنا چاہئے، یہ آیات ہمیں متنبہ کر رہی ہیں، ہماری عقل کو کھول رہی ہیں اور جذبات کو ابھار رہی ہیں۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخُذُوا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُوْنَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَائَكُمْ مِّنَ الحَقِّ﴾

”اے لوگوں جو ایمان لائے ہو، اگر تم میری راہ میں جہاد کیلئے اور میری رضاجوئی کیلئے نکلے ہو، تو میرے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ کہ انکے ساتھ محبت کی طرح ڈالو، جب کہ تمہارے پاس حق آیا ہے جس کا وہ انکار کر چکے ہیں“۔(سورہ ممتحنہ؛60:1)

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے:

﴿لا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِينَ وَ مَن يَّفْعَلْ ذَلِکَ فَلَيْسَ مِنَ اللهِ فِي شَيْءٍ﴾

”اہلِ ایمان کو چاہیئے کہ وہ اہلِ ایمان سے ہٹ کر اہلِ کفر کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے“۔(سورہ آل عمران؛3:28)

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے:

﴿وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُوْنُونَ سَوَاءً﴾

”وہ تو چاہتے ہیں کہ جیسے اُنہوں نے کفر کیا، کسی طرح تم بھی کفر کر کے ان کے برابر ہو جاؤ“۔(سورہ النساء؛4:89)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿بَشِّرِ الْمُنَافِقِيْنَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَاباً أَلِيْمَاً الَّذِينَ يَتَّخِذُوْنَ الكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾

”منافقین کو خبر دے دو کہ ان کیلئے دردناک عذاب ہے جو اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کفار کو اپنا دوست اور رفیق بناتے ہیں“۔(سورہ النساء؛4:138،139)

اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لاَ تَتَّخِذُواْ الكَافِرِينَ أَوْلَيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِينَ أَنْ تَجْعَلُوْا للهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَاناً﴾

”اے لوگوں جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست اور رفیق نہ بنانا۔ کیا تم اپنے خلاف اللہ کی صریح حجت فراہم کرنا چاہتے ہو“۔(سورہ النساء؛4:144)

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا:

﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لاَ تَتَّخِذُواْ الَّذِينَ أَتَّخَذُواْ دِيِينَكُمْ هُزُواً وَ لَعِباً مِّنَ الَّذِينَ أُوتُواْ الكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ أالكُفَّارَ أَوْلِيَآءَ﴾

”اے لوگوں جو ایمان لائے ہو، تم سے پہلے جن کو کتاب ملی تھی، جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنالیا ہے، انہیں اور کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ“۔(سورہ المائدہ؛5:57)

اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا:

﴿إِنَّ الكَافِرِينَ كَانُواْ لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيناً﴾
”یقیناً اہلِ کفر تمہارے کھلے دشمن ہیں“۔ (سورہ النساء؛5:101)

مزید ارشاد ہے کہ:

﴿أَلَمْ تَرَإِلَى الَّذِينَ أُوتواْ نَصِيباً مِّن الكِتَابِ يَشْتَرُونَ الضَلالَةَ وَ يُرِيْدُوْنَ أَنْ تَضِلُّواْ السَبِيلَ وَ اللهُ أَعْلَمَ بِأَعْدَائِكُمْ﴾
”کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں خوش نصیبی یعنی کتاب ملی تھی، وہ گمراہی مول لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راستے سے بھٹک جاؤ۔ اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے“۔ (سورہ النساء؛44،45:5)

یہ ہے وہ معاندانہ رویہ جس کا ہمیں کفار سے مظاہرہ کرنا چاہئے، ان سے نفرت ہونا چاہئے نہ یہ کہ ہم اُن سے دوستی کرنے لگیں۔ اگر ان کے اور ہمارے درمیان جنگ ہوتی ہے تو ہمیں ان سے جہاد کے اصولوں کے مطابق معاملہ کرنا چاہئے۔ انگریز، فرانسیسی، امریکن، روسی اور دوسرے کفار ممالک ہمارے دشمن ہیں اور دراصل یہی وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے احیاء کے خلاف جنگ چھیڑے ہوئے ہیں اور یہ نہیں چاہتے کہ کسی طرح اسلامی ریاست قائم ہو۔ یہ اسلامی افکار کے پھیلاؤ کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں تاکہ کسی بھی طرح اسلامی افکار کی سچائی اور موزونیت ظاہر نہ ہونے پائے۔ اسلئے اسلامی افکار کو پھیلانے کیلئے سخت جدوجہد ناگزیر ہے۔ یہ جدوجہد ان ہی مکاروں، منافقوں اور ان کے ایجنٹوں کے خلاف کرنا پڑے گی۔

اس سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے مختلف علاقوں میں کافر استعمار سے آزادی تو حاصل کر لی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج بھی یہ علاقے ایک طرف تو مختلف ملکوں میں بٹے ہوئے ہیں اور دوسری طرف ان کے حکمراں مسلمان ہونے کے باوجود مسلمانوں پر کافرانہ نظام کے تحت ہی حکومت کر رہے ہیں۔ اسلئے جدوجہد کافرانہ نظام کے خلاف ہو گی نہ کہ کافر کے خلاف؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت امت دو مصیبتوں سے دوچار ہے، پہلی یہ کہ اس کے حکمراں کافر استعمار کے ایجنٹ ہیں دوسری یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت نہیں کر رہے یعنی یہ کافرانہ نظام کے تحت حکومت کر رہے ہیں۔ اسی لئے ہمارا یہ فرض ہے کہ ان جگہوں پر جہاں کے حکمراں کفار کے ایجنٹ نہیں ہیں جیسے ترکی اور افغانستان، جہاں ہماری جدوجہد کافرانہ نظام کے خلاف ہو گی تاکہ اس نظام کو ختم کر کے اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق نظام چلانے کیلئے کام کیا جائے یعنی اسلامی خلافت کے قیام کیلئے۔ جہاں تک ان ملکوں کا سوال ہے جہاں کے حکمراں کافروں کے ایجنٹ ہیں جیسے پاکستان، عراق، اردن، لبنان، سعودی عرب، ایران، متحدہ عرب امارات اور انڈونیشیا وغیرہ، امت پر یہ فرض ہے کہ وہ ان چاپلوس ایجنٹوں کے خلاف جدوجہد کرے اور ان کے کالے کرتوت فاش کرے۔ یہاں بھی کافرانہ نظام کے خلاف جدوجہد ہو گی تاکہ اس کو ہٹا کر اس کی جگہ اسلام کا اقتدار قائم ہو اور قرآنی احکام نافذ ہوں۔ کفار کے ایجنٹ سیاسی میدان میں اسلامی افکار کے پھیلاؤ کے خلاف سخت مزاحمت کر رہے ہیں، یہ کام وہ اپنے طریقے سے کفار ممالک کے اکسانے پر کر رہے ہیں، کیونکہ اسلامی دنیا کے

حکمراں تین طرح کے حالات میں گھرے ہوئے ہیں جن سے وہ اس حد تک متاثر ہیں کہ ان میں سے کچھ کا بحیثیت ایک نظام زندگی اور نظام حکومت اسلام پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ خود کافر ہو گئے ہیں اگر چہ کہ وہ نماز پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں اور ان میں سے کچھ امت کی اصلاح کے تعلق سے امید کھو بیٹھے ہیں لیکن وہ اسلام پر ایک نظامِ حیات اور نظامِ حکومت کی حیثیت سے یقین رکھتے ہیں۔ جہاں تک ان تین صورتوں کا سوال ہے وہ اس طرح ہیں: پہلی، زندگی حکومت اور بین الاقوامی تعلقات کیلئے ایک آفاقی عقیدہ۔ دوسرے امت کے اوپر اعتماد کی کمی کہ یہ دوسری اقوام کے مقابلہ میں کوئی قائدانہ رول ادا کر سکتی ہے۔ تیسرے ان طاقتور کافر قوموں کا خوف کہ ان کے پاس عام تباہی کے ہتھیار ہیں اور ان کی چالیں اور مکاریاں بڑی خطرناک ہیں۔ اس سوچ کی وجہ سے مسلمان خود کو کافروں کی عالمی طاقتوں ( Super Powers) کے مقابلے میں مسلسل کمزور محسوس کر رہے ہیں اسی لئے یہ ممالک انہی بڑی طاقتوں میں سے ایک نہ ایک پر اپنی سلامتی کیلئے منحصر رہتے ہیں۔ نتیجتاً یہ حکمراں اسلامی ریاست کے قیام کی طرف بڑھائے گئے کسی بھی قدم سے پیدا ہونے والے خطرے کو سمجھتے ہیں۔ اسی لئے وہ اسلام سے ایک دوری بنائے رکھتے ہیں اور بڑی طاقوں سے مدد حاصل کرنے کی تلاش میں رہتے ہیں اور اقتدار میں رہنے کیلئے انہی کی طاقت پر منحصر رہتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ خود اپنے ملک اور اپنے لوگوں پر اعتماد و انحصار کریں۔ انہی دغاباز کفار کے اشاروں پر یہ چلتے ہیں اور انہی کی منشا کو پورا کرنا ان کا مقصد ہوتا ہے۔ اس طرح مغربی کفار کے آلۂ کار کی حیثیت سے وہ ہر اس کام کی مخالفت

کریں گے جس سے امت کے اندر اسلامی افکار و قوانین کے تعلق سے اعتماد پیدا ہو یعنی سیاسی راستے سے اسلامی افکار کے پھیلنے میں اپنے آقاؤں کی منشا کے مطابق رکاوٹیں کھڑی کریں گے۔ اس طرح مخالفت دراصل مغربی کفار کی طرف سے ہے نہ کہ مسلم حکمرانوں کی طرف سے، نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں مسئلے کی اس بنیاد کو سمجھنا چاہیئے۔ ہمارے لئے یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ امت کے احیاء اور ریاست کے دوبارہ قیام کے راستے میں یہ سب سے بڑی اور بنیادی رکاوٹ ہے اور مسلمانوں کو اس کیلئے اچھی طرح تیار رہنا چاہیئے۔ یہ جدوجہد تو ہونا ہی ہے اور یہ بالکل جہاد کی طرح فرض ہے۔

کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ اس جدوجہد کے علاوہ ایک اور مشکل ہے وہ یہ کہ کیا اسلام میں اس کی اہلیت ہے کہ وہ خصوصاً خالص سیاسی اقدامات کے تعلق سے زمانے کے ساتھ چل سکے؟ تو معاملہ صرف ریاست کو قائم کرنے کا نہیں ہے، یہ تو نسبتاً آسان کام ہے۔ بلکہ معاملہ اس ریاست کو عالمی منظر نامہ پر قائم رکھنے کا ہے، دنیا کے ممالک کے درمیان اس کو مخصوص مقام دلانے کی کوشش اور بین الاقوامی منظر نامہ پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت اور اس کے ساتھ ہی اسلامی افکار کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔ پھر ہم کو ان مسائل کا حل بتانا پڑے گا جن کا ہر بدلتے زمانے کے ساتھ پیش آنا ضروری ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے اور اس میں نئے نئے مسائل پیدا ہونا فطری بات ہے، اسلئے اسلام کو ہر زمانے کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ زمانے کا ساتھ دینا ایک غیر واضح اور مبہم بات ہے۔ اگر اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی قوانین کو اس طرح

ڈھالنا چاہئے کہ موجودہ دور سے اس کی مطابقت ہو جائے تو اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ جیسے اسلامی معاشرے میں سود خوری حرام ہے۔ جب یہ معاشرہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت آیا اور یہ غیر اسلامی معاشرہ ہو گیا اور سود خوری اس معاشرے کی اقتصادی ضرورت ہو گئی، تو معاشرے میں سود خوری کو حلال کر لیا گیا۔ یہ عمل منکر ہے اور اس کی اجازت نہیں ہے، سود خوری تو قیامت تک حرام ہی رہے گی، چاہے یہ زندگی کی ایک ضرورت ہی کیوں نہ بن جائے۔ اسلام کی نظر میں زمانہ، حالات یا معاشرے کی تبدیلی کی کوئی کسوٹی نہیں ہے، ہمیں معاشرے کو بدلنا ہو گا نہ کہ حکمِ شرعی کو۔ اگر "زمانے کا ساتھ دینے" کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہر اس مسئلے کا حل ہے جو زمانے کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں تو یہ بالکل دوسری بات ہوئی جو کہ ایک حقیقت ہے۔ مثلاً خلیفہ مسلمانوں کے نمائندوں سے واقف بھی رہتا تھا اور انہی سے صلاح و مشورہ کیا کرتا تھا۔ مجلسِ شوریٰ عوامی نمائندوں کی جماعت تھی جو وقتِ ضرورت ریاست کو مشورے دیتی اور اس کے ارکان کا انتخاب عوام ہی کرتے تھے، اس طریقے سے ریاست لوگوں کی رائے معلوم کرتی تھی۔ اس معاملے کو اس کی حقیقت کے مطابق سمجھنے کی ضرورت ہے، یہ مجلس حکمرانوں کو مشورہ دینے اور ان کا محاسبہ کرنے کیلئے تھی نہ کہ قانون سازی یا حکم دینے کیلئے، یہ وہ معاملہ ہے جس کا تقاضہ شارع نے کیا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ شَاوِرْهُمْ فِي الأمْرِ﴾

"اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو"۔ (سورہ آل عمران: 3:159)

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے:

﴿وَ أَمْرُهُمْ شُوْرَى بَيْنَهُمْ﴾

''ان کا معاملہ ان کے آپس کے مشورے سے چلتا ہے''۔(سورہ الشوری؛42:38)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(افضل الجهاد كلمة الحق عند سلطانٍ جائر)

''افضل ترین جہاد جابر حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے''۔

اسلئے اس مجلس کی تشکیل کے وقت اس کے انتخاب میں نمائندگی کا اصول منطبق ہو گا، کیونکہ اس مجلس کے ارکان لوگوں کے نمائندے ہوتے ہیں جو لوگوں کی طرف سے رائے دیتے ہیں۔ رائے دینے کیلئے نمائندگی کی اجازت ہے، جیسے کسی تنازعہ یا جائداد وغیرہ میں نمائندگی۔ کیونکہ رائے دینے کیلئے نمائندگی کی اجازت ہے، اسلئے ہر شخص کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی رائے دینے کیلئے کسی کو بھی اپنا نمائندہ بنا سکتا ہے چاہے وہ مرد ہو، عورت ہو، مسلم ہو یا غیر مسلم اور وہ جس کی چاہے نمائندگی کر سکتا ہے، چاہے وہ مرد ہو، عورت ہو، مسلم ہو یا غیر مسلم۔ تاہم ایک غیر مسلم احکام کی تشریع میں نمائندگی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا تعلق احکام شرعیہ سے ہے اور یہ غیر مسلم ان پر ایمان نہیں رکھتا۔ غیر مسلموں کو خلیفہ کے انتخاب میں بھی اپنی رائے دینے کی اجازت نہیں ہو گی کیونکہ صرف مسلمان ہی خلیفہ کو بیعت دیتے ہیں۔ ویسے ہر شخص کو اس کا حق ہے کہ وہ کسی کو بھی اپنا نمائندہ مقرر کرے اور وہ خود بھی کسی کا نمائندہ ہو سکتا ہے، ہر اس معاملے میں جس میں

شریعت نے اسے حق دیا ہے۔ اس طرح جسے بھی ریاست کی شہریت حاصل ہے وہ جس شخص کو چاہے اپنا نمائندہ منتخب کر سکتا ہے اور وہ خود بھی کسی کے ذریعہ مجلسِ شوریٰ کیلئے منتخب ہو سکتا ہے۔ اس اصول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام زمانے کی ہر چیز کا ساتھ دیتا ہے بلکہ شریعت میں یہ اہلیت ہے کہ وہ ہر زمانے کے ہر مسئلہ کو حل کر سکتی ہے۔ ''اگر زمانے کا ساتھ دینے'' کا مطلب ان کاموں سے ہے جن کی اجازت ہے جیسے مباح چیزیں جو پہلے موجود نہیں تھیں یا کوئی چیز موجودہ ذوق کے مطابق استعمال کرنا، جیسے اگر کوئی یورپ میں رہتا ہے تو وہاں ترکی ٹوپی کے بجائے ہیٹ استعمال کرنا۔ یا کسی لیڈر کا اپنے لئے محافظ (Body guards) مقرر کرنا، یا کسی میٹنگ وغیرہ کیلئے پہلے سے وقت کا تعین کرنا وغیرہ، یہ اس طرح کے کام ہیں جن کی اجازت ہے، اس طرح کے کام چاہے کسی بھی زمانے میں ہوں، چاہے ان سے ایسا لگے کہ یہ زمانے کے ساتھ چلنا ہے۔ اگر زمانے کے ساتھ چلنے کا مطلب بین الاقوامی تعلقات کو نباہنا یعنی زمانے اور حالات کی تبدیلی کے مطابق معاملات کرنا ہے تو شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے اس کی اجازت ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی ریاست کو اجازت ہے کہ وہ کسی کافر ملک سے اچھے پڑوسی کی حیثیت سے رہنے کا معاہدہ کر لے اور جس ملک سے مناسب نہ سمجھے، نہ کرے، کیونکہ یہ سب کام مسلمانوں کے یا اسلامی ریاست کے مفاد کے پیشِ نظر کئے جائیں گے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے پڑوسی کی حیثیت سے رہنے کے معاہدے بنی مدلج اور بنی ضمرۃ میں سے ان کے اتحادیوں کے ساتھ کئے جبکہ دوسرے قبائل پر حملہ آور ہوئے۔ اس رائے کی ایک اور مثال یہ ہے کہ اسلامی ریاست

کو اس کی اجازت ہے کہ اہلیت رکھنے کے باوجود بین الاقوامی صورتِ حال اور اپنی ریاست کے مخصوص منصوبوں کے پیش نظر، اسلامی حکومت قائم کرنے کیلئے کسی خاص ملک کو فتح نہ کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایلاۃ کے حکمران یوحنا بن رؤبۃ سے اس شرط پر معاہدہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو جزیہ دے گا اور اس کے بدلے میں مسلمان اس کی کشتیوں اور قافلوں کو سمندر اور خشکی پر تحفظ فراہم کریں گے، آپؐ نے اسے لوگوں کا حکمران رہنے دیا اس حقیقت کے باوجود کہ وہ کافر تھے یعنی آپؐ اس بات پر راضی ہو گئے تھے کہ وہ کافر رہیں اور کافرانہ قانون ان پر نافذ رہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نیاہلِ جرباء اور اہلِ اذرح کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کیا یعنی اُنہیں کافر رہنے دیا اور کافرانہ نظام کے تحت رہنے کی اُنہیں اجازت دی۔ یہ تینوں قبیلے رومی حکومت کے تحت آتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو فتح کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔ تبوک میں آپؐ تیس ہزار افراد پر مشتمل فوج لے کر پہنچے تھے اور جیسے ہی رومی فوج کو اس کی خبر ملی، وہ بغیر میدانِ جنگ میں مقابلہ کئے وہاں سے فرار ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو ان علاقوں پر قبضہ کر سکتے تھے جو رومی حکومت کے تحت آتے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنہیں چھوڑ دیا۔ اس کے علاوہ شرعی حکم یہ ہے کہ کفار اسلامی ریاست کو جزیہ ادا کریں لیکن اس طرح کے حالات بھی پیش آ سکتے ہیں کہ اسلامی ریاست کافر ملک کو جزیہ دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ احزاب میں دیکھا کہ مسلمانوں میں خوف اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ اللہ کی طرف سے مدد اور فتح کے تعلق سے

شک میں پڑ گئے تھے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس صورتِ حال کا ذکر اپنی کتابِ پاک میں اس طرح کیا ہے:

**﴿إِذْجَاءُ وْكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الأَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ القُلُوبُ الحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّونَ بِاللّٰهِ الظُّنُونَاْ (10)هُنَالِکَ اْبْتُلِیَ المُؤْمِنُونَ وَ زُلْزِلُواْ زِلْزَالاً شَدِیداً(11)﴾**

”یاد کرو جب وہ تمہارے اوپر تھے اور تمہارے نیچے سے بھی تم پر چڑھ آئے، اور جبکہ نگاہیں پتھرا گئیں اور دل حلقوم تک پہنچ گئے، اور تم اللہ کے بارے میں خیالات باندھ رہے تھے۔ اس وقت مومنین آزمائے گئے اور بالکل ہلا دیئے گئے“۔ (سورہ الأحزاب؛ 33:10،11)

اس صورتِ حال کی وجہ سے کفار کے درمیان تفریق ڈالنے کیلئے ایک تدبیر کی اور ان میں سے کچھ کو لڑائی سے دست بردار ہونے پر آمادہ کرلیا۔ آپ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ غطفان کے دو سرداروں عیینۃ بن حصن بن حذیفۃ بن بدر اور الحارث بن عوف بن ابی حارثہ سے گفتگو کر کے یہ پیشکش کی کہ وہ اور ان کے ساتھی اپنے آپ کو جنگ سے علیٰحدہ کرلیں، اس کے بدلے میں مسلمان اُنہیں مدینے کی ایک تہائی فصل دیں گے۔ ان کی طرف سے اس پیشکش کو قبول کر لینے کے بعد تحریری معاہدہ ہونے سے پہلے ان سے ایک زبانی اور عارضی معاہدہ ہو گیا۔ اس پر دستخط کرنے سے پہلے آپ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ اور سعد بن عبیدہ رضی اللہ عنہ سے اس معاہدے کے بارے میں اپنی رائے دینے کو کہا۔

(يا رسول الله:امراً تحبه فتصنعه أم شيئاً أمرک الله به لابد لنا من الهمل به أم شيئاً تصنعه لنا، قال:بل شيئاً أصنعه لكم، والله ما أصنع ذلک إلاَّ لأنّي رائت العرب قد رمتكم عن قوس واحدة وكا لبوكم(أي أشتدوا عليكم) من كل جانب فاردت أن اكسر عنكم شوكتهم إلى أمر ما۔ فقال له سعد ابن معاذ: يا رسول الله قدكنّا نحن و ہؤلاءِ القوم على الشرک بالله و عبادة الأوثان لا نعبد الله ولا نعرفه ولا هم يطمعون أن ياكلوا منا تمرة ألاّ قرى او بيعاً، أفحين أكرمنا الله بالإسلام و هدانا له و أعزنابک و به نعطيهم أموالنا؟ والله ما لنا بهاذا من حاجة، والله لا نعطيهم إلا السيف حتى يحكم الله بيننا و بينهم۔ قال رسول الله: (أنت وذاک))

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ و سلم کیا یہ آپ کی خواہش ہے کہ ہم ایسا کریں یا یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے جس کی ہمیں تعمیل کرنا ہے یا یہ ایسی چیز ہے جو آپؐ ہماری خاطر کر رہے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے جواب دیا: نہیں یہ میں تمہاری خاطر کر رہا ہوں۔ اللہ کی قسم! میں ایسا نہ کرتا اگر یہ حقیقت میں دیکھ نہ رہا ہوتا کہ تمام اطراف و جوانب سے پورے عرب جمع ہو کر تمہارے اوپر حملہ آور ہو رہے ہیں، اس وجہ سے میں تمہارے خلاف اُن کی طاقت کو توڑنا چاہتا ہوں۔ حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ و سلم)! یہ لوگ اور ہم مشرک تھے، نہ تو ہم اللہ کو جانتے تھے اور نہ اس کی عبادت کرتے تھے اس زمانے میں اُنہیں ہم سے کبھی یہ امید نہ رہی کہ وہ ہماری ایک کھجور بھی کھالیں سوائے یا تو مہمان کی حیثیت سے یا خرید کر۔ اب جبکہ اللہ نے ہمیں عزت دی اور اسلام کی طرف ہدایت دی اور آپ صلی اللہ علیہ و سلم کے ذریعہ ہمیں شہرت ملی، اب کیا اِنہیں اپنا مال (جزیہ میں) دے دیں؟ اللہ کی قسم!

ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کی قسم! ہمارے پاس اِنہیں دینے کیلئے تلوار کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ان کے اور ہمارے درمیان اللہ کا فیصلہ ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم جیسا چاہو گے ویسا ہی ہو گا“۔ پھر سعدؓ نے وہ کاغذ لیا اور اوپر جو کچھ لکھا تھا اسے مٹا دیا اور کہا، "اِنہیں جو کچھ ہمارے خلاف کرنا ہے کر لیں“۔

اس طرح جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ اُن کے لئے جنگ جاری رکھنا بہت مشکل ہو رہا ہے۔ اسلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے سامنے کچھ مال کے بدلے میں جنگ سے دستبردار ہونے کی پیشکش کی جو اُنہوں نے قبول کر لی۔ لیکن اس معاہدے پر دستخط ہونے سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعدؓ ابن معاذ اور سعدؓ ابن عبیدہ سے مشورہ کر کے اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمان جنگ کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ اسلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ذہن بدل دیا اور قاصدوں کو واپس کرتے ہوئے فرمایا: ”تم لوگ واپس جاؤ اور تمہارے لئے صرف تلوار ہے“۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس حقیقت کے باوجود کہ کفار جزیہ ادا کرتے ہیں اگر ریاست یہ محسوس کرے کہ حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ مسلمانوں کو جزیہ دینا چاہیئے تو ایسی حالت میں اس کی اجازت ہے کہ مسلمان خراب حالت کو ٹالنے کیلئے کافر ملک کو جزیہ دیں۔ یہ تمام واقعات نشاندہی کرتے ہیں کہ کسی بھی مسئلے کو سلجھانے کیلئے وقت اور صورتِ حال کی مناسبت سے اصول بنائے جاتے ہیں۔ ریاست کی صورتِ حال مختلف ہونے کی وجہ سے مسئلے کو سلجھانے کیلئے ایک اصول کو بدل کر دوسرا اصول بنایا گیا۔ اگرچہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ زمانے کے

ساتھ چلنا ہے جبکہ حقیقت میں یہ شریعت کے مطابق چلنا ہے نہ کہ زمانے کے ساتھ۔ اس طرح حکم شرعی کو تبدیل کرنے کی اجازت نہیں ہے جب تک کہ شرعی دلیل سے کسی مسئلے کے متعلق حکم کو تبدیل کرنے کی اجازت ثابت نہ ہو جائے۔ اسلئے جب مسلمانوں کی حالت کمزور ہو تو ریاست کو اس کی اجازت ہے کہ وہ کفار ریاستوں کو کچھ مال دے سکتی ہے لیکن اس کی بالکل اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی سرزمین پر کافر ریاستوں کو ہوائی اور فوجی اڈّے بنانے کی اجازت دے کیونکہ ایسا کرنا اپنے علاقے پر کفار کو اختیار دینا ہو گا، یہ ایسا معاملہ ہے جس کی بالکل اجازت نہیں ہے۔ اسی طرح سرحدی معاہدے کر کے کچھ سرحدوں تک اپنے آپ کو محدود کر لینے کی بھی ریاست کو اجازت نہیں ہے کیونکہ اس کا مطلب جہاد کو معطل کر دینا ہو گا۔ تاہم ریاست کو اس کی اجازت ہے کہ وہ پڑوسی سرحدوں کا کچھ متعین مدت کیلئے احترام کرے نہ کہ غیر معینہ مدت کیلئے۔ اس طرح اس کی بھی اجازت ہے کہ ریاست بین الاقوامی تعلقات کے پیشِ نظر مختلف صورتِ حال کے مطابق دوسری ریاستوں سے معاملات کرے، لیکن یہ تمام معاملے شرعی حکم کے مطابق ہوں گے ان سے انحراف کرنے کی ذرا بھی اجازت نہیں ہے۔

اگر "زمانے کے ساتھ چلنے" کا مطلب ایسی پالیسی بنانا ہے جو زمانے کے تقاضوں کو پورا کرے تو اس کی اجازت ہے، کیونکہ یہ کسی ایک مباح معاملے کا انتخاب کرنا ہے۔ سیاست سے مراد ایسی سرگرمیوں سے ہے جن سے ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کرنا مقصود ہو جو ممکنہ حد تک اپنے مقصد کے حصول میں معاون ہوں۔ اس کا مطلب بھی مباح معاملات سے ہے۔ اس طرح ریاست

حالات کے مطابق جنگی پالیسی بنا سکتی ہے اور کوئی سیاسی قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اصلاً یہ جنگی منصوبے بنا سکتی ہے اور کسی بھی سیاسی چال کا جواب دے سکتی ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ جنگ کیلئے ہمیشہ تیار ہے۔ ریاست ایسی منصوبہ بندی کر سکتی ہے اور ایسی سیاسی چالیں چل سکتی ہے جس سے دشمن کیلئے ایسے مسائل پیدا کئے جائیں کہ اگر وہ ایک مسئلے سے پیچھا چھڑائے ہو تو جب تک دوسرا مسئلہ سامنے آجائے۔ ریاست کو اس کام کیلئے قابلِ لحاظ طاقت مہیا کرنا ہو گی تاکہ وہ دشمن کے سامنے مسائل پر مسائل کھڑے کر سکے۔ اس طرح اگر دشمن اسلامی ریاست کے خلاف جنگ چھیڑ دے تو ریاست دونوں طریقوں سے اس کا بھرپور جواب دے، اس طرح کی پالیسیوں کی اجازت ہے۔ اس طرح اگر ریاست محسوس کرے کہ وقت کی صورتِ حال کی مناسبت سے کسی ایک لائحۂ عمل کو کسی دوسرے ممکنہ اقدام پر ترجیح دینا ریاست کے حق میں بہتر ہے تو وہ ایسا کر سکتی ہے،، اس سے بظاہر ایسا لگے گا کہ ریاست زمانے اور وقت کے حساب سے چل رہی ہے جبکہ درحقیقت یہ ایسا کام ہو گا جس کی اجازت ہے اور جس کا زمانہ تقاضہ بھی کرتا ہے۔ اس طرح زمانے کے ساتھ چلنے کے معاملے میں اگر زمانے کے مسئلے کی وضاحت ہو گئی تو اس تعلق سے ابہام ختم ہو گیا۔ جب ہر مسئلے کی تعریف اور معانی متعین ہو جائیں، پھر اس کے متعلق شرعی رائے معلوم ہو جائے تو اس معاملے کا ابہام ختم ہو جاتا ہے۔ اگر ہمارا مطلب یہ ہے کہ اسلامی شریعت کا عام متن اس کی اہلیت رکھتا ہے کہ وہ ہر زمانے کے ہر مسئلے کو حل کرے تو یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلامی شریعت ہر زمانے میں قابلِ عمل ہے۔ تاہم اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اصولوں میں اتنی

لچک ہے کہ وہ زمانے کے حساب سے اپنے آپ کو ڈھال لے تو ایسے زمانے کا اسلام ساتھ نہیں دیتا۔ لیکن زمانے کے ساتھ چلنے کا مطلب چاہے وہ سیاست میں ہو یا قانون سازی میں، عملی حقیقت پسندی سے ہے، جو لوگ عملی اور حقیقت پسند ہوتے ہیں وہ زمانے کے ساتھ چلتے ہیں چاہے وہ کتنے ہی قدامت پسند ہوں اور وہ پرانی چیزوں کو اسلئے نہ چھوڑنا چاہتے ہوں کہ وہ پرانی ہیں۔ جو عملی اور حقیقت پسند نہیں ہوتے ان کی سختی انہیں توڑ دیتی ہے۔

تشریع (قانون سازی) اور سیاست میں سب سے خطرناک بات نظریاتی مفروضے اور منطقی بحثیں ہوتی ہیں جن سے بہت نقصان پہنچتا ہے، اس سے غلطیاں ہوتی ہیں اور اصل موضوع سے بھٹک جاتے ہیں، کیونکہ سیاست اور قانون سازی کا معاملہ قابلِ فہم حقیقت اور عمرانیات سے پڑتا ہے۔ یہ مانا جاتا ہے کہ ہر حقیقت کے اپنے حالات اور تقاضے ہوتے ہیں، جن کو حقیقت سے علیحدہ نہیں کیا جانا چاہئے۔ بلکہ یہ ضروری ہے کہ ہر متعین معاملے کی حقیقت کے مخصوص حالات کی طرف توجہ دی جائے۔ اسلئے سیاست اور قانون سازی میں تعمیم (عام کرنا) اور حالات سے علیحدگی (تجرید) ضروری ہے۔ مثلاً باشندوں یا عمرانیات کے معاملات میں ایک معاملے کو دوسرے معاملے سے مماثلت کی وجہ سے قیاس نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ کسی ایک پہلو سے ان میں مماثلت کے باوجود وہ دوسرے پہلوؤں سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ سیاست اور قانون سازی میں بہت خطرناک معاملہ قیاسِ شمولی کا ہے۔ جہاں تک تشریع کا سوال ہے، متعین تشریع وحی کے ذریعہ ہی ہوتی ہے، یہ کچھ متعین کاموں کیلئے احکام ہیں اور ان کاموں کے علاوہ اور کہیں ان کا اطلاق نہیں

ہوتا۔ اسلئے صرف مماثلت کی وجہ سے اِن پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اِن میں مماثلت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس قسم یا نوع کے اعمال ہونے کی وجہ سے حکم لگایا جا سکتا ہے۔ اگر متن میں علّت بتائی گئی ہے تو اس کا اطلاق صرف وصف کی اُسی قسم پر ہو گا جو بذاتِ خود حکم کی علت میں سے ہو نہ کہ اس کی مماثلت کی وجہ سے۔ اگر ہم نے اس اصول سے انحراف کیا تو یہ دلیل سے استنباط کیا ہوا حکم شرعی نہیں ہو گا کیونکہ دلیل اسکی نشاندہی نہیں کرتی بلکہ یہ اس میں پائی جانے والی یکسانیت کی نشاندہی کرتی ہے۔ اسلئے کچھ علماء جیسے ابن حزم، متن کی ظاہری تعبیر سے وابستگی کی وکالت کرتے ہیں۔ امام حزم کا یہ موقف اس خدشے کی بناء پر ہے کہ اس حکم میں محض یکسانیت کے شبہ کی وجہ سے کوئی ایسی قسم یا وصف داخل نہ ہو جائے جو متن میں کہی گئی بات سے یا شریعت یا لغت سے مختلف ہو۔ دوسرے علماء جیسے امام جعفر بھی قیاس سے احتراز کرنے کی وکالت کرتے ہیں، کیونکہ اِن کے نقطۂ نظر سے جو متن علّت کے ساتھ آیا اسکی علّت حکم کی علامت کے طور پر آتی ہے۔ اس طرح ان علماء کے مطابق شرعی حکم جس میں حکم کی علامت ہو کہ ”فلاں چیز کا یہ حکم ہے اور یہ اس کی علامت ہے“ اس معاملے میں کوئی قیاس نہیں ہے۔ یہ سب احتیاط نظریاتی مفروضوں اور منطقی معاملات کے خطروں کی وجہ سے کرنا پڑتا ہے، کیونکہ صرف یکسانیت کی وجہ سے غلط قیاس کر لیا جاتا ہے جو غلطی اور غلط رہنمائی کی طرف لے جاتا ہے۔ سیاسی امور میں معاملہ اور بدتر ہوتا ہے کیونکہ یہاں مسئلہ تنہا ہوتا ہے اور شاذ و نادر ہی مسائل میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ یہ بہت الجھے ہوئے رہتے ہیں، ان کے ایک دوسرے میں گتھم گتھا ہونے کی وجہ سے ان کا سمجھنا مشکل ہوتا

ہے۔ اس لئے متعین طور پر اس کے لئے حکم لگانے سے پہلے تنہا متعلقہ معاملے کا مطالعہ کیا جانا چاہیئے اس کے بغیر سچائی تک پہنچنا ناممکن ہے، سوائے اس کے کہ ایسا اتفاقاً ہو جائے۔ اس طریقے کے علاوہ اس کو سمجھنا بہت مشکل ہو گا اور صحیح نتیجے تک پہنچنے میں غلطی کا امکان رہے گا۔ اسلئے تشریع اور سیاسی امور میں ہر وقت کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے ایک مستقل بنیاد ہونا چاہیئے جو تبدیل نہ ہو۔ یہ ضروری ہے کہ تمام معاملات کا اُن کی مکمل حقیقت کے مطابق مطالعہ ہونا چاہیئے۔ ان کی باہمی یکسانیت کو کوئی وزن نہیں دیا جانا چاہیئے۔ مسئلے کا حل دریافت کرتے وقت عملی پہلو کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے یعنی آیا اس کا حل ممکن بھی ہے یا نہیں، دوسرے الفاظ میں یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ قابلِ عمل بھی ہے یا نہیں۔ اس طرح نظریاتی مفروضے اور منطقی معاملات کو الگ الگ سمجھنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ واقعات کی تعمیم اور اُن سے وابستہ حالات کو علیحدہ علیحدہ رکھ کر مطالعہ کرنا غلط قیاس سے بچاتا ہے۔ اس سے تشریع اور سیاسی امور دونوں اپنی اپنی جگہ پھلتے پھولتے رہیں گے۔ اس طرح امت “زمانے کے ساتھ” چلنے کی اہل ہو گی، بین الاَقوامی معاملات میں اسے ایک اہم مقام حاصل رہے گا بلکہ دنیا کے ملکوں میں وہ قائدانہ رول ادا کر سکے گی۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ وسیع اسلامی سرزمین کو متعدد ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ان میں مختلف دستور اور قوانین نافذ ہیں۔ چالیس سال سے زیادہ عرصے سے اِن میں ان دساتیر کے ذریعہ حکومت ہو رہی ہے جو اسلام اور احکامِ شرعیہ سے ٹکراتے ہیں، جو تمام ہی کافرانہ نظام اور قانون کے تحت کام کر رہے ہیں۔ اس طرح اگر زمانے کے مسائل کو حل کر لیا گیا تو بھی یہ دستور اور

قانون رکاوٹ بنے رہیں گے۔ اس لئے اس کا حل یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ اسلامی ریاست کیلئے ایسا دستور تیار کیا جائے جو اسلامی ریاست کے متعدد علاقوں یا ولایات میں متنوع مسائل، مختلف حالات اور جدا جدا تقاضوں کی طرف توجہ دے، اور یہ ضروری ہے کہ ایسے قوانین وضع کئے جائیں جن میں جدید زمانے کے تمام مسائل کا حل ہو۔ اس کا صحیح حل تو یہ ہے کہ اصل میں اسلامی افکار اور احکامِ شرعیہ کے تعلق سے اعتماد پیدا کیا جائے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعہ نازل ہوئے ہیں، جو جبرئیل علیہ السلام لے کر آئے جس میں انسان کے تمام مسائل کا حل ہے۔ ان پر عمل کر کے ہی انسان خوش اور مطمئن رہ سکتا ہے۔ اگر یہ چیز وجود میں آجائے تو ریاست بھی وجود میں آجائے گی۔

یہ سچ ہے کہ امت کے اندر عقیدے کا وجود ہے اور یہ امت ایک اسلامی امت ہے نہ کہ کافر امت۔ تاہم اس عقیدے کا دنیوی زندگی کے افکار اور نظامِ شریعت سے رشتہ ٹوٹ گیا ہے، زندگی میں اس کی اہمیت اور مقام ختم ہو گیا ہے اور ایک طرح سے یہ مردہ عقیدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ مسلمانوں کو اس سے اب وہ زبردست تحریک نہیں مل رہی جس سے وہ دنیا کو فتح کر پائیں، انسانیت پر حکومت کریں، ہدایت کو عام کریں اور حق وانصاف کا پرچم بلند کریں۔ یہاں تک کہ اس عقیدے کے حاملین نے جنت کی کشش ہی کھو دی اور اس کی نظر دنیوی حد تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس وجہ سے مسلمان اللہ کی یاد سے غافل ہو گئے، اس سے امید لگانا اور مدد طلب کرنا چھوڑ دیا۔ خالق کو چھوڑ کر یہ مخلوق سے امیدیں لگانے لگے، انسانوں سے مدد مانگنے لگے اور مادّی

طاقت پر زیادہ بھروسہ کرنے لگے۔ مسلمانوں کے اندر اس عقیدے میں آخرت کا تصور بھی دھندلا ہو گیا۔ اللہ کی رضا حاصل کرنے کا نصب العین بھی ان کے اندر نہیں رہا۔ ان کی نظریں دنیوی خواہشات پوری کرنے پر مرکوز ہو گئیں۔ اس طرح مسلمان بڑے مکان، خوبصورت کار اور دنیوی عیش و آرام کے چکر میں پڑ گئے۔ ان کی خواہش مادی اشیاء کے حصول اور دولتمندوں کی خوشنودی حاصل کرنے تک محدود ہو گئی۔ یہاں تک کہ یہ عقیدہ قیامِ لیل کرنے والوں، نفلی روزے رکھنے والوں اور گناہوں سے بچنے والوں تک کو ان عبادات سے آگے نہیں لے جا سکا اور اُن کی توجہ دنیا کمانے تک ہی محدود ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ شرعی احکام کی پابندی کا کچھ احساس نہیں رہتا۔ اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے اور صرف اسی کلمہ کو بلند کرنے کے کام کی مسلمانوں کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں رہی اور نہ ہی اُن کی ترجیحات میں اس کا کوئی مقام رہا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس حالت میں امت سے ریاست کے قیام کیلئے کہا جائے۔ بنیادی افکار کو درست کئے بغیر دستور اور احکامات کی بات کرنا بے معنی ہے کیونکہ دستور اور احکام تو اُن افکار سے ہی نکلتے ہیں جن سے شریعت وجود میں آئی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کے اندر اسلامی عقیدے کا احیاء ہو تا کہ زبانوں سے پہلے اُن کے دل اس بات کی گواہی دیں کہ ہمارے وجود کیلئے اسلامی افکار و احکام ناگزیر ہیں، اُن سے ہمارا تعلق اور لگاؤ کسی بھی دوسری چیز کے مقابلے میں زیادہ ہونا چاہئے۔ ایک دفعہ ہمارے دل یہ سب پکار اُٹھیں اور اسی طرح کے ہمارے خیال ہو جائیں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہمارے لئے دنیا کی کسی بھی چیز سے زیادہ

عزیز ہو جائیں، تب یہ خیال امت کو ایک امت کی حیثیت سے جمع کرے گا جس کے اوپر ریاست قائم ہوتی ہے، جس سے احکام نکلتے ہیں اور جو امت کے اندر زندگی کی روح پھونک دیتی ہے۔ اس کے بعد دستور اور قوانین کا بنانا آسان ہو جائے گا۔ اسی لئے کسی بھی چیز سے پہلے دلوں اور دماغوں میں اُس کی ضرورت کے احساس کو پیدا کرنا ہے۔ دراصل اس خیال کی غیر موجودگی بیماری کی جڑ اور بد قسمتی کی بنیاد ہے اور اس کو پیدا کرنا، اس کا حل اور علاج ہے۔ اصل معاملہ امت کے احیاء اور ریاست کے قیام کا ہے۔ امت کا احیاء افکار کے ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ دستور اور قوانین سے۔ ریاست کو قائم کرنے کا مطلب مسلمانوں کیلئے خلیفہ کے تقرر سے ہے۔ خلیفہ کا تقرر احکام کے قیام کی خاطر ہوتا ہے، احکام کو ہی اپنے اعلیٰ اور ارفع معنوں میں سیاست کہتے ہیں، یعنی یہ دل و دماغ کا عمل ہے۔ اسی طرح اسلامی عقیدہ جس سے زندگی کے متعلق افکار وجود میں آتے ہیں، دماغ کو بیدار کرتا ہے اور قلب کو جذبات سے بھر دیتا ہے اور ان دونوں چیزوں سے ہی انسان عمل پر آمادہ ہوتا ہے۔ یہ عمل ہی حکم ہے یعنی انسانوں اور اُن کے معاملات کو منظم کرنا ہے۔ اس کی ضرورت نہیں ہے کہ پہلے دستور اور قوانین وجود میں آئیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ پہلے دل و دماغ ان مستنیر افکار سے بھر جائیں اس کے بعد دستور اور قانون کی ضرورت خود سامنے آئے گی۔ اسلئے پہلی چیز جس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، وہ افکار ہیں جو زندگی کو ایک نقطۂ نظر دیں یعنی کسی بھی چیز سے پہلے ایک زندہ اسلامی عقیدہ ہونا ضروری ہے۔ ایک مرتبہ یہ وجود میں آجائے تو ریاست بھی وجود میں آجائے گی، تب اس کے بعد دستور اور قوانین وجود میں آجائیں گے۔

لوگوں کی زندگی کے روزمرہ کے مسائل، قوانین اوراحکام کے ذریعہ حل کئے جاتے ہیں، یہ قوانین اوراحکام زندگی کے متعلق نقطۂ نظر سے برآمد ہوتے ہیں یعنی ایک زندہ عقلی عقیدے سے، اس کی بنیاد پر ہی وہ اقتدار قائم ہوتا ہے۔ اس طرح دستور و قوانین وہ لوازمات ہیں جن سے حکومت کی جاتی ہے یہ بذاتِ خود کسی ریاست کی بنیاد نہیں ہوتے، یہ افعال و اعمال کے جانچنے کی کسوٹی بھی ہوتے ہیں جن سے شہریوں کے معاملات نمٹائے جاتے ہیں اور جن کے ذریعہ ان کے فیصلے کئے جاتے ہیں جن کے اوپر حکومت کی جارہی ہو۔ یہ وہ معاملات ہیں جن کیلئے حکومت قائم کی جاتی ہے اور امت حکمران کا تقرر کرتی ہے۔ یہی وہ اصول و ضابطے ہیں جن کے ذریعہ حکمراں امت پر حکومت کرتا ہے اور ایک مخصوص طرز اور متعین طریقے سے لوگوں کے معاملات کو نمٹاتا ہے یا ان کے مسائل کو حل کرتا ہے۔ یہ ایک پالیسی ہے جو دل و دماغ سے نکلتی ہے، واقعتاً جس کا ادراک ہوتا ہے اور جذبات جس کے تابع ہوجاتے ہیں۔ یہ حکمراں کے اندر حکومت کیلئے جوش پیدا کرتی ہے، اس کی پالیسی کو زندگی بخشتی ہے جو دل کی دھڑکن بن جاتی ہے۔ اس طرح امت کے ذریعہ ریاست کے قیام کی بنیاد دستور اور قوانین نہیں ہیں، یہ تو عقلی عقیدے کو زندگی بخشتے ہیں اور اس عقیدے سے قوانین اور دستور وجود میں آتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں امت کو یقینی تباہی سے بچانے کیلئے بنیادی طور پر اسلامی افکار کو زندہ کرنا اور اسلامی خلافت کو قائم کرنا ہوگا، یعنی امت کے اندر اسلامی افکار کے تعلق سے اعتماد پیدا کرنا، اُن کے صحیح اور سچ ہونے اور اُن کے موزوں ترین ہونے کا یقین پیدا کرنا ہے، یعنی مسلمانوں کے دلوں کے اندر اسلامی عقیدے کو زندہ کرنا ہے۔

## اے مسلمانو!

یقیناً ہماری امت بہترین امت ہے جو انسانوں کیلئے وجود میں لائی گئی ہے، یہ اُس کیلئے شرم کی بات ہے کہ وہ کوئی عبث کام کرے اور یہ اس کا بہت بڑا جرم ہو گا اگر وہ اپنے وجود کو خطرے میں ڈالے۔ یہ وہ امت ہے جس نے ہدایت کی روشنی ساری دنیا میں پھیلائی اور انسانیت کو حق و انصاف سے روشناس کرایا۔ اس نے ریاست میں اپنے شہریوں کے ساتھ ہمیشہ عدل کا سلوک کیا، اُن کے ساتھ معاملہ کرنے میں رحم سے پیش آئی، ان کا ہر لحاظ سے خیال رکھا اور سکون و اطمینان کے ساتھ ان کو استحکام بھی دیا۔ جس نے بھی اُن کی دعوت کو قبول کیا اُن کی زندگی کو مسرّت سے بھر دیا۔ یہ وہ امت ہے جس کا کام ہی لوگوں کو شرک و کفر سے بچانا ہے۔ ملت کے لاکھوں کروڑوں بیٹوں نے اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کیلئے جامِ شہادت نوش کیا۔ اس کی زندگی کا بنیادی کام لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا اور اس کا حتمی مقصد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔

یہ ایک متواضع اور عظیم الشان امت ہے جس کے اوپر ساری انسانیت کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لانے کی ذمہ داری ہے۔ انسانیت اس کی محتاج ہے کہ یہ امت اس کو مادّیت کی حرص اور بے اطمینانی کی حالت سے نکال کر تقوے کا سکون اور ایمان کی راحت دے۔ آج امت تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ کفر ہر پہلو سے اس کے وجود کو مٹانے پر تُلا ہوا ہے۔ کفار نے صنعتوں، ایجادات اور مادّی ترقی کی چکاچوند دکھا کر "فکری برتری" کا جھانسا دیا اور دینِ اسلام کے افکار و

قوانین میں امت کے اندر شکوک و شبہات پیدا کر دئے۔ اس طرح انہوں نے امت کے سامنے نئ نئ ایجادات کے راستے، کافرانہ افکاراور صنعتی ترقی کے ذریعہ اپنے کھوکھلے قوانین پیش کئے۔ اس طرح انہوں نے امت کو ایک آزمائش میں ڈال دیا اور اس کے اندر اسلامی افکار و قوانین کے تعلق سے شکوک پیدا کر دئے یہاں تک کہ وہ ایسے مقام پر پہنچ گئ کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اسے جانا کہاں ہے۔ ایک مرتبہ جب اُنہوں نے اسلامی ریاست کو ختم کر دیا اور اسلامی خلافت کا وجود مٹا دیا اورامت جب پریشانی اور بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئ تو انہوں نے اس کو مزید تباہی کے راستے پر ڈال دیا یہاں تک کے وہ بالکل بے اثر ہو کر رہ گئ۔ آج چالیس سال تک اسی طرح چلنے کے بعد انہوں نے امت کو اس کھوکھلے پن کی حدوں تک لا کر کھڑا کر دیااور اس کو اس طرح دھکا دیا ہے کہ وہ کرب وتکلیف کی آخری حدود تک پہنچ گئ ہے۔ اب کیا تم پچھلی امتوں کی طرح اس امت کو بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جانے دوگے ؟اگر ایسا ہوا تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ اُن لوگوں کو لا کھڑا کرے گا جو اس کے پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں گے، اس کے دین کی حمایت کریں گے اور اس کی دعوت دیں گے اور وہ تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإنْ تَتَوَلَّواْ يَسْتَبْدِلْ قَوماً غَيرَكُمْ ثُمَّ لاَنوا أَمْثَالَكُمْ﴾

”اور اگر تم پھر جاؤ تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا، پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے “۔ (سورہ محمد: آیت38)

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿إلاَّ تَنْفِرُواْ يُعَذِّبْكُمْ عَذَاباً أَلِيماً وَ يَسْتَبْدِلْ قَوْمَاً غَيرَكُمْ﴾

”اگر تم نہ نکلو گے تو وہ تمہیں دردناک عذاب دے گا اور وہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا“۔ (سورہ التوبۃ: 9:39)

یا تم دل و جان سے اس کو بچانے کی کوشش کرو گے تاکہ وہ اس لائق ہو سکے کہ وہ ایک مرتبہ پھر اپنے پیغام کو دنیا والوں تک پہنچائے اور اُنہیں کفر، گمراہی اور پریشانیوں سے نجات دلائے اور عالمِ انسانیت کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائے۔

**اے مسلمانو!** تمہارا تحفظ ممکن نہیں ہے جب تک کہ تم اللہ کی طرف نہ پلٹو، اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط نہ کرلو، اُس سے ہی مدد طلب کرو، اُسی پر بھروسہ کرو یہاں تک کہ تم اس کی رضا حاصل کرلو جو کہ زندگی کا نصب العین ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دین کو پھیلانا، اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا، اللہ کی مخلوق کے ساتھ رحم کرنا اور اللہ کے بندوں کو مسرّتوں سے ہمکنار کرنا ہی تمہاری امت کو تباہی سے بچا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کفر کے دماغ کو ٹھیک کرنا پڑے گا، طاغوت کے سر کو کچلنا پڑے گا اور جھوٹ اور الحاد کو دنیا سے مٹانا پڑے گا۔ روشن فکر کے ساتھ سخت جدوجہد، اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کیلئے جہاد اور اللہ کی راہ میں دل و جان کو قربان کئے بغیر ہم یہ سب حاصل نہیں کر سکتے۔ اسلئے تمہارے پاس کوئی طاقت نہیں ہے سوائے اللہ کے اور تمہیں کسی کی مدد نہیں

چاہئے سوائے اللہ کے۔ صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی مدد کرنے اور فتح دینے والا ہے۔ وہی بہترین حافظ و ناصر ہے۔

اے مسلمانو! زمین سے تمہارا لگاؤ بہت ہو چکا، اب آسمان کی طرف دیکھو۔ دنیا کی عارضی لذتوں کی طرف تمہاری دلچسپی بہت بڑھ گئی ہے، اب آخرت کی دائمی مسرّتوں کی طرف دھیان دو۔ یہ وقت ہے جنت کی آرزو کرنے کا، اس کی مہک کو محسوس کرنے کا اور اس کے حصول کی حتی الامکان کوشش کرنے کا۔ جنت کی خواہش ہی تمہارے لئے جدوجہد کی راہ ہموار کرے گی اور میدانِ جنگ کی تیاری میں مددگار ہوگی۔ اللہ کی اس پکار کا جواب دو:

﴿وَسَارِعُواْ إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَـٰوَاتُ وَٱلأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾

"اور اپنے ربّ کی مغفرت اور اُس کی جنت کی طرف بڑھو جس کی وسعت آسمانوں اور زمین جیسی ہے، وہ اُن لوگوں کیلئے تیار ہے جو ڈر رکھتے ہیں"۔ (سورہ آل عمران؛3:133)

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا جواب دو:

(قوموا الى جَنَّة عَرْضُها السَمٰوٰت وَ الاَرض)

"اُس جنت کی تیاری کرو جس کا عرض زمین و آسمان کے برابر ہے"۔

جن لوگوں نے بیعتِ عقبۂ ثانی کی تھی، اُس وقت کہا تھا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں چاہے اس کے لئے ہمیں اپنی جائیدادیں اور مال و اسباب کھونا پڑیں یا اپنی

اولاد کی قربانی دینا پڑے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں آپ کا ساتھ دینے پر کیا ملے گا؟ آپ ؐ نے اعتماد سے جواب دیا، "جنت الفردوس"۔

اے مسلمانو! اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کا بدلہ جنت الفردوس ہے۔ اللہ تعالیٰ کا پاک ارشاد ہے:

**﴿إِنَّ اللّٰهَ أشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُم وَ أَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الجَنَّةَ يُقَاتِلونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُونَ وَ يُقْتَلُونَ﴾**

"بے شک اللہ نے مومنین سے اُن کی جانیں اور اُن کے مال جنت کے بدلے میں خرید لئے ہیں، وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں تو وہ مارتے بھی ہیں اور مارے بھی جاتے ہیں"۔ (سورہ بقرۃ: 2:111)

جی ہاں! جنت الفردوس، اے مسلمانو! یہ وہ معاملہ ہے جو تم نے اللہ سے کیا ہے جس کے تحت تم اللہ کے راستے میں لڑتے ہو، مرتے بھی ہو اور مارے بھی جاتے ہو۔ کیا یہ وقت نہیں آگیا ہے کہ تم جنت کی آرزو کرو اور اللہ سے وہ معاملہ کرو جس میں تمہیں کچھ کھونا نہیں ہے، اس میں تمہیں اپنے آپ کو بیچنا ہے تاکہ اللہ کی رضا حاصل ہو سکے جبکہ وہ تم کو پکارتا ہے جس میں تمہارے لئے زندگی ہے:

**﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ اسْتَجِيْبُواْ لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ﴾**

> ”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ اور رسول کی دعوت پر لبّیک کہو جب رسول تمہیں اس چیز کی دعوت دیں جو تمہیں زندگی عطا کرنے والی ہے“۔ (سورہ الأنفال؛ 8:24)

اے مسلمانو! تمہاری پریشانی یہ ہے کہ اسلامی عقیدے کی روشنی تمہارے دلوں سے محو ہو گئی ہے جس کا اثر یہ ہوا ہے کہ تمہارے اعمال سرد پڑ گئے ہیں، تمہارے برتاؤ میں اس کی حرارت نہیں رہی ہے اور تمہاری روح مردہ ہو گئی ہے۔ اسلئے قرآنی احکام سے اس کو روشن کرو اور اللہ کے ذکر سے اس کو تازگی دو۔ دوبارہ وہی چیز اپنے اندر پیدا کرو جو صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں تھی۔ اللہ کا اقتدار قائم کرنے کیلئے کام کرکے، اور قرآن کا پرچم بلند کرکے اسلامی افکار و قوانین پر اعتماد سے اسے روشن کرو۔ پوری انسانیت کو دعوت دے کر اسے چمکا دو تاکہ تم اسے کفر کی تاریکیوں اور گمراہی سے نکال کر اسلام کی روشنی میں لے آؤ، تمام آفات و مشکلات سے نکال کر اُسے سکون اور اطمینان اور مسرّتیں دو۔ اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری سے اسے زندگی بخشو، اس کی سزا سے ڈرتے ہوئے اور جنت کی امید کرتے ہوئے، اللہ سے اپنے تعلق کو مضبوط کرتے ہوئے، اپنے برتاؤ میں اُسے یاد کرتے ہوئے اور اپنے ہر عمل میں اُس کی مرضی کا خیال رکھتے ہوئے اپنے دل کو اس کیلئے تیار کرو۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور دعا پر اکتفاء کرکے نہ بیٹھ جاؤ بلکہ جہاں ضرورت ہو حق بات کہو، جہاں بھی جھوٹ ہو، اس کے خلاف جدوجہد کرو، ہر وقت اور ہر موقع پر کفار و منافقین کے خلاف مقابلے کیلئے تیار رہو۔

اے مسلمانو! تمہارے اصل مرض کی تشخیص کر دی گئی یعنی اسلامی افکار و قوانین سے تمہارا اعتماد اُٹھ جانا ہی اصل بیماری ہے اور اس کا علاج بھی تمہیں بتا دیا گیا، یعنی اسلامی افکار و قوانین کی بنیاد پر اسلامی خلافت کا قیام۔ دوپہر کے سورج کی طرح چمکتا ہوا لائحۂ عمل بھی تمہارے سامنے واضح ہے۔ ہدف بھی اس طرح متعین ہو گیا کہ ہر شخص اسے محسوس کر سکتا ہے۔ اسی لئے ہم آپ کو دعوت دے رہے ہیں کہ اللہ سے اپنے تعلق کو مضبوط کر کے، اللہ کی طرف لوگوں کو دعوت دے کر، اللہ کی شریعت میں یقین پیدا کر کے اور اسلامی اخوت کو مسلمانوں کو جوڑنے کی واحد بنیاد بنا کر اپنے دلوں میں اسلامی عقیدے کو زندہ کریں۔ ہمارا آپ سے یہ کہنا ہے آپ سچی قربانی اور مکمل بیداری کے ساتھ اسلامی افکار کی عام تبلیغ اور اس کی خاطر محنت کے ذریعہ اسلامی خلافت کو قائم کرنے کیلئے انتھک کوشش اور لگاتار جدوجہد کریں۔ اسلامی پرچم کو تمام جھنڈوں سے اونچا کرنے اور اللہ کے کلمہ کو سب سے بلند کرنے اور اسلام کے پیغام کو روشنی، ہدایت اور رحمت کی حیثیت سے ساری دنیا میں پہنچانے کی ذمہ داری دوبارہ سنبھالیں۔

**حزب التحریر**

15 جمادی الاول، 1382ھ

13 اکتوبر، 1962ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

## صداء کا خلاصہ

1) کفّار نے مغرب میں اپنی ایجادات اور انکشافات کی آڑ میں مسلمانوں کے خلاف فکری یلغار کی تا کہ مسلمان بالکل بے بس ہو جائیں۔ اُن افکار میں ہی شکوک پیدا کئے جن کی بنیاد پر اسلامی ریاست قائم تھی تا کہ اس ریاست کو ختم کیا جا سکے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مبداء کی بنیاد پر قائم کسی ریاست کو ختم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ مفکرین اور سیاست دانوں کا ان افکار، ان کی کسوٹی اور اُن پر جو یقینِ کامل ہو، اُن پر سے اعتماد متزلزل کر دیا جائے جن کی وجہ سے ریاست وجود میں آتی ہے تو ایسی ریاست کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے، پھر ریاست کیسے اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہے۔ اس طرح اُنہوں نے اسلامی ریاست کو فی الواقع ختم کرنے سے قبل اس کی روح کو نکال دیا۔

2) نظامِ خلافت کو مٹانے اور مسلمان مفکرین اور سیاست دانوں میں مغربی افکار اور قانون سازی سے محبت پیدا کرنے کے بعد مغربی کفار نے مسلمانوں کی سرزمین پر مکمل اختیار حاصل کر لیا۔ اس طرح انہوں نے مسلمانوں پر کافرانہ نظام مسلط کر دیا، اس کے علاوہ انہوں نے مسلمانوں کو اُن افکار، کسوٹی اور یقینِ کامل کے تعلق سے شک میں ڈال دیا جن کی بنیاد پر امت قائم ہے۔ اس طرح مسلمانوں کو باہم جوڑنے والے اس بندھن کو کمزور کر دیا اور امت کو تباہی کے راستے پر لا کھڑا کیا۔

3) مسلمانوں پر کافروں کے مسلسل تسلط اور تقریباً دو نسلوں تک ان کے اوپر نظامِ کفر کے جاری رہنے کی وجہ سے اپنی زندگی میں اسلامی افکار اور احکام کے نافذ ہونے کے تعلق سے وہ مایوسی کا شکار ہو گئے۔ کفّار نے مسلمانوں کے درمیان ایک امت اور ایک ریاست کی حیثیت سے دوبارہ قیام کے تعلق سے سخت مایوسی پیدا کر دی۔ اس طرح امت تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی اور اب اسے اپنا وجود ہی خطرے میں نظر آ رہا ہے۔

4) امت کے وجود کو مکمل تباہی سے بچانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ اسلامی افکار اور احکامات کے تعلق سے اس میں دوبارہ اعتماد بحال کیا جائے اور اسلام کی اہمیت اُن کو اس طرح سمجھائی جائے کہ یہ اُن کی زندگی اور موت کا مسئلہ بن جائے۔ اسی لئے مسلمان کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ اس اعتماد کی بحالی کے سلسلے میں ہونے والی کوششوں میں سستی کا مظاہرہ کرے اور نہ اس کی اجازت ہے کہ وہ اس مقصد کیلئے ہونے والی سیاسی جدوجہد اور فکری جنگ میں پیچھے رہ جائے۔

5) اسلامی خلافت مسلم دنیا کو ایک پرچم تلے متحد کرتی ہے، اپنے اقتدار کے ذریعہ اسلام کی قوّت کا تحفّظ کرتی ہے اور مسلمانوں کو اس لائق کر دیتی ہے کہ وہ اپنی دعوت کو ساری دنیا میں پہنچا دیں، یہ مسلمانوں کو ایک بین الاقوامی طاقت بنا دیتی ہے جو عالمی حالات پر اثر انداز ہوتی ہے اور قوموں کی قسمتیں بدل دیتی ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس کے قیام کو تمام مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے۔ اسی لئے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ سیاسی طریقے سے اسلامی دعوت کے ذریعہ اس ریاست کے

قیام کی حتی الامکان کوشش کرے۔ صرف خلافت کا قیام ہی امت کو تباہی سے بچا سکتا ہے اور جو اس کو بہترین امت بنا سکتا ہے جو لوگوں کیلئے برپا کی گئی ہے۔